۱۶ جون ۲۰۱۹ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۲ ۔ شمارہ نمبر: ۱۲

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔
۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔
۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔
۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔
۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

بھارت: خوف کا نیا دور

Michael Safi

بھارت میں عام انتخابات کے نتائج دیکھ کر سیاسی مبصرین اور بالخصوص نریندر مودی کے ناقدین کی رائے یہ ہے کہ اب بھارت کی سیاسی ثقافت مکمل طور پر تبدیل ہو جائے گی۔ نریندر مودی دوسری بار وزیراعظم بنے ہیں اور اُن کے پہلے دورِ حکومت کی کارکردگی دیکھتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اب بھارت کے مسلمانوں کے لیے بھی مسائل بڑھ جائیں گے۔

نریندر مودی کے دوسری بار وزیراعظم بننے پر بھارتی مسلمانوں میں بجا طور پر خوف پایا جاتا ہے۔ اُنہیں اندازہ ہے کہ دوسری بار بھرپور انتخابی کامیابی بھارتیا جنتا پارٹی کے کارکنوں اور قیادت کی طرزِ فکر و عمل میں مسلمانوں کے حوالے سے مزید سختی پیدا کرے گی۔ پہلے دورِ حکومت میں بھی بھارتیہ جنتا پارٹی نے مسلمانوں کے لیے غیر لچک دار رویہ اپنایا تھا۔ انتہا پسندی عروج پر تھی۔ نئی دہلی کے نواح میں گڑ گاؤں کے علاقے میں مقامی کونسل کے سربراہ شہزاد خان کہتے ہیں کہ بھارت میں مسلمان محفوظ نہیں۔ مسائل بڑھ گئے ہیں۔ بھارت میں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش بیس کروڑ ہے۔ اتنی بڑی اقلیت ہونے کے باوجود اُنہیں مسائل کا سامنا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے دوبارہ اقتدار میں آنے پر بھارتی مسلمان خود کو مزید الگ تھلگ محسوس کر رہے ہیں۔ اُن کے خدشات میں اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو کچھ پچھلے دور میں ہوا اب اُس سے زیادہ ہوگا۔

حالیہ انتخابات کے حوالے سے جو مہم چلائی گئی تھی وہ کئی حوالوں سے انتہائی نوعیت کی تھی۔ ایک طرف تو آسام میں بسنے والے بنگالی مسلمانوں کو بنگلا دیشی قرار دے کر انہیں ملک سے نکالنے پر زور دیا گیا اور دوسری طرف گاندھی جی کو قتل کرنے والے نتھو رام گوڈسے کو حقیقی محبِ وطن قرار دینے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ نتھو رام گوڈسے نے بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی کو اس لیے قتل کیا تھا کہ اُس کے خیال میں وہ مسلمانوں کے مطالبات کو کچھ زیادہ اہمیت دے رہے تھے اور اُن کی طرف جھک گئے تھے۔

انتخابی مہم کے دوران مسلمانوں کے خلاف نفرت کی لہر پیدا کرنے کی بھرپور کوشش سے بھارتیا جنتا پارٹی نے کسی بھی مرحلے پر گریز نہیں کیا۔ اس کے باوجود قوم نے بی جے پی کو پسند کیا اور ۲۷ کروڑ ووٹروں نے بی جے پی کو مینڈیٹ سے نوازا جو ایک نیا ریکارڈ ہے۔

آج کے بھارت میں مسلمانوں کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والے مسائل سے متعلق کتاب کی مصنفہ نازیہ ارم کہتی ہیں ''پانچ سال قبل جب بھارتیا جنتا پارٹی نے ووٹ مانگے تھے تب اُس کے سامنے ترقی کا ایجنڈا تھا۔ اِس نکتے پر زور دیا گیا تھا کہ بھارت کو نئی زندگی بخشی جائے گی۔ قوم کو یقین دلایا گیا تھا کہ ترقی کا نیا دور شروع ہوگا، جس کے نتیجے میں عوام کو بھرپور زندگی بسر کرنے کا موقع ملے گا۔ ہمیں یقین تھا کہ پانچ سال قبل بی جے پی نے اقتدار ملنے کے بعد جو کچھ کیا تھا اُس کی روشنی میں اِس بار قوم غلطی نہیں کرے گی، یعنی حساب مانگے گی اور ووٹ کے ذریعے فیصلہ سنائے گی۔ مگر افسوس کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم غلطی پر تھے''۔

اِس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بھارت میں واضح ہندو اکثریت اور مسلم اقلیت کے درمیان کشیدگی رہی ہے اور دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے اندرونی اختلافات بھی کم نہیں رہے، مگر پھر یہ انتہائی افسوسناک امر یہ ہے کہ بی جے پی کے گزشتہ دور میں گائے کی حفاظت کے نام پر میدان میں نکلنے والے انتہا پسندوں کے ہاتھوں ملک بھر میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے تشدد میں اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ دور میں گائے کی حفاظت کا ذمہ لینے والے انتہا پسند ہندوؤں کے ہاتھوں ۳۶ مسلمان جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

گڑ گاؤں میں دوسرے علاقوں سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ لوگ مقامی فیکٹریز میں ہندوؤں کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ گڑ گاؤں صنعتی علاقہ ہے جس میں آئی ٹی کی بہت سی فرمز بھی کام کرتی ہیں۔ اس علاقے میں مسلمانوں کے لیے نماز پڑھنے کی جگہ بھی کم پڑتی جا رہی ہے۔ مساجد میں زیادہ گنجائش نہیں، جس کے

اندرونی صفحات پر

- چین: ناکامی کو شکست!
- شام کی خانہ جنگی۔۔ حتمی مرحلہ یا ایک نیا آغاز۔۔
- ٹرمپ، اِخوان المسلمون اور دہشت گردی
- قطر کے خلاف پابندیوں کے محرکات
- بھارت میں مسلم تشخص بدلنے کی کوششیں
- ترکِ وطن: چند ثقافتیں شاید افضل ہیں
- ماحولیاتی تبدیلیاں اور دَم توڑتی زمینیں

باعث مسلمان سڑکوں پر یا کھلے مقامات پر نماز ادا کرتے ہیں۔ اس پر بہت سے ہندوؤں کو اعتراض ہے۔ مسلمانوں کو نئی مساجد تعمیر کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جارہی۔

کھلے مقامات پر نماز ادا کرنے کے خلاف مہم چلانے والے ہندو قوم پرست گروپ کے سربراہ راجیو متل کا کہنا ہے کہ ہماری مہم دراصل ٹاؤن پلاننگ کے اصولوں کے مطابق ہے۔ ہم اس بات کے خلاف نہیں کہ مسلمان نماز پڑھیں۔ ہمارا زور اس بات پر ہے کہ وہ مساجد میں یا پھر نماز کے لیے مختص دیگر مقامات ہی پر نماز ادا کریں۔

بھارتیا جنتا پارٹی کے بہت سے کارکن اور قائدین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حال ہی میں ختم ہونے والے نریندر مودی کے پہلے دورِ وزارتِ عظمیٰ کے دوران ہندو مسلم فسادات کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہی۔ اُن کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ بھارت میں مسلمانوں سے نفرت کی لہر نہیں پائی جاتی۔ انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی بہت سی تنظیموں اور گروپس کی رائے البتہ کچھ اور ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ بی جے پی کے پچھلے دورِ حکومت میں مسلمانوں کو نشانے پر رکھنے کی روش پروان چڑھائی گئی اور اُن کے خلاف نفرت میں بھی اضافہ ہوا۔ نریندر مودی کے ناقدین کا کہنا ہے کہ اُن کے گزشتہ دورِ حکومت میں مجموعی طور پر فضا ایسی رہی کہ مسلم مخالف جذبات کو کھل کر پنپنے کا موقع ملا اور اِس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ مسلمان خود کو پہلے سے زیادہ غیر محفوظ تصور کرتے ہیں۔ انتہا پسند ہندو اب بہت کھل کر سامنے آچکے ہیں۔ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے میں ذرا بھی باک محسوس نہیں کرتے۔

ہیومن رائٹس واچ کی ساؤتھ ایشین ڈائریکٹر میناکشی گانگولی کہتی ہیں ''فسادات سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اب کسی بھی وقت کسی بھی مسلمان کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ سبزی بیچنے والے مسلمانوں کو بھی گھیر کر تشدد کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ بہت سے مسلمان گھر سے کھانا لے کر نکلتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں گائے کا گوشت چیک کرنے کے نام پر تلاشی لینے کے عمل میں اُنہیں تشدد کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ انتہا پسند ہندو یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُنہیں کسی بھی معاملے میں اختلافی آواز اٹھانے کا پورا حق ہے اور اس معاملے میں وہ تشدد کی راہ پر گامزن ہونے سے ذرا بھی گریز نہیں کرتے۔ دوسری طرف مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو پورا یقین ہے کہ اگر اُنہیں تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا تو ریاست کسی بھی مرحلے پر مداخلت نہیں کرے گی''۔

حالیہ انتخابی مہم نظریاتی اعتبار سے غیر معمولی تھی۔ کانگریس کے ششی تھرور کہتے ہیں کہ یہ بھارت کے لیے نظریاتی اور روحانی شناخت کا معاملہ تھا۔ اُن کا استدلال ہے کہ بی جے پی نے بھارت کی نظریاتی شناخت کو انتہائی مسخ کردیا ہے۔ نریندر مودی کے پہلے دورِ حکومت میں جو کچھ ہوا، اُس کے مقابلے میں اب بہت زیادہ ہوگا۔ بہت جلد بھارت آبادی کے حوالے سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہوگا اور ایسے میں انتہا پسندی کا جن پوری طرح بوتل سے باہر آگیا تو خرابیاں بڑھ جائیں گی۔

بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کے دور میں بھارتی قوم پرستی جس نوعیت کی تھی وہ اب کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ تب قومی سوچ غالب تھی، جس میں تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے پنپنے کی گنجائش تھی اور لوگ تمام باتیں بھول کر بھارت کا سوچتے تھے۔ بی جے پی نے ہندو انتہا پسندی کو اس قدر پروان چڑھایا ہے کہ اب بھارت کا سیکولرازم داؤ پر لگ چکا ہے اور بھارت کے ہندو ریاست ہونے کا بھرپور تاثر ابھر کر سامنے آچکا ہے۔

جواہر لعل نہرو مجموعی طور پر اس بات کے حق میں تھے کہ بھارت میں تمام مذاہب کے لوگ مل کر رہیں اور ملک کی بہبود کے لیے کام کریں۔ دوسری طرف ونایک ساورکر تھے جو اگرچہ ملحد تھے مگر ہزاروں سال سے اس خطے میں بسے ہوئے ہندوؤں کو ملک کی سب سے بڑی حقیقت کے طور پر تسلیم کرانے کے حق میں تھے اور اُن کے نظریے کی روشنی میں بھارت میں صرف ہندوؤں کے لیے گنجائش تھی، مسلمانوں کے لیے ذرا بھی گنجائش نہ تھی۔ ساورکر کے نظریے کے مطابق صرف ہندوؤں کو بھارت کی سرزمین پر رہنے کا حق تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ اُن کے دیوی دیوتاؤں، رسوم و رواج اور ثقافت کا تعلق بھارتی سرزمین سے تھا۔ دوسری طرف مسلم اور مسیحی اُن کی نظر میں بھارت میں رہنے کے حق دار نہ تھے کیونکہ اُن کی مقدس سرزمین عرب تھی یا پھر فلسطین۔ اور یہ کہ اُن کے خدا کی سرزمین بھی بھارت نہ تھی۔

کون ہندوستانی ہے اور کون نہیں، اس حوالے سے ہندوؤں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ساورکر کی نظر میں صرف ہندوؤں کو ہندوستان میں رہنے کا حق تھا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہر ہندو کو عسکری تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ ان کے نظریات کے مطابق معرض وجود میں آنے والی تنظیم راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی سوچ میں اب تھوڑی بہت تبدیلی واقع ہوچکی ہے۔ اس تنظیم سے تعلق رکھنے والے بہت سے اذہان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں اور مسیحیوں کو نظر انداز کرکے بھارت کو مکمل تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کی نظر میں مسلمان اور مسیحی بھی اپنے مذہب کے ساتھ ملک کا لازمی حصہ ہیں اور اُنہیں تسلیم کیا جانا چاہیے۔

انتہا پسند اور بنیاد پرست ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ جواہر لعل نہرو نے سیکولرازم کی بات صرف اس لیے کی تھی کہ مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کیے جاسکیں۔ اُن کے خیال میں مسلمانوں کو شرعی اصولوں کے مطابق شادی کی اجازت دے کر یا کشمیریوں کے لیے زیادہ خودمختاری کا اعلان کرکے صرف ووٹ بٹورے جاسکتے ہیں، بھارت کی حقیقی خدمت نہیں کی جاسکتی۔

آج بھارتی معاشرہ مکمل طور پر تبدیل ہوچکا ہے۔ جواہر لعل نہرو نے ہندو قوم پرستی کی شکل میں ابھرنے والی انتہا پسندی کو کچلنے کے لیے آر ایس ایس پر پابندی سمیت بہت سے اقدامات کیے۔ یہ تمام اقدامات اب کچرا کنڈی کی نذر ہوچکے ہیں۔ آج کے بھارت میں سیکولرازم کے پنپنے کی گنجائش برائے نام دکھائی دے رہی ہے۔ مجموعی سوچ انتہا پسندی کی ہوچکی ہے۔ بی جے پی اس سوچ کو مزید پروان چڑھانے پر تُلی ہوئی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ کبھی کبھی کوئی ہندو مسلم فساد ہوجاتا تھا۔ اب یہ سب کچھ یومیہ بنیاد پر ہو رہا ہے۔ تعلیمی اداروں میں جہاں جہاں ہندو اکثریت ہے وہاں مسلم اور دیگر غیر مسلم طلبہ کو واضح طور پر امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے، انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور پوری کوشش کی جاتی ہے کہ وہ دب کر رہیں، اُن کی شخصیت مسخ ہوجائے۔ نازیہ ارم نے اپنی کتاب کی تیاری کے لیے درجنوں طلبہ اور ان کے والدین سے گفتگو کی۔ انہیں بتایا گیا کہ تعلیمی اداروں کو انتہا پسندوں نے خصوصی طور پر نشانہ بنایا ہے۔ بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ بہتر انداز سے تعلیم مکمل نہ کرسکیں اور اُن میں مجموعی طور پر خوف کا ماحول برقرار رہے۔ اعلیٰ درجے کے تعلیمی اداروں میں بھی یہی ماحول پنپ رہا ہے۔ ایک دور تھا کہ کسی بھی معاملے پر ہندو مسلم فساد ہوتا تھا تو کچھ دن بعد معاملات معمول پر آجاتے تھے اور سب پھر مل جل کر رہنے لگتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہے۔ اب مسلمانوں میں الگ تھلگ رہنے کا رجحان خطرناک حد تک پروان چڑھ چکا ہے۔ وہ

////// باقی صفحہ نمبر ۱۵ \\\\\\

چین: ناکامی کو شکست!

Philip P. Pan

دوسرا اور آخری حصہ

مارکیٹ کو آزاد کرنا

کمیونسٹ پارٹی دسمبر میں چین کو تبدیل کر کے رکھ دینے والی اصلاحات اور آزاد معیشت کی پالیسیوں کی ۴۰ ویں سالگرہ منائے گی، چینی حکومت فتح مندی کا جشن منانے کے لیے پروپیگنڈے کا آغاز کر چکی ہے اور صدر شی قوم کی اس کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھنے کے لیے خود کو مرکزی رہنما کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ ڈینگ کے بعد شی پارٹی کے طاقتور ترین رہنما بن کر ابھرے ہیں، لیکن انہوں نے ڈینگ کی وراثت کو لپیٹ دیا ہے، شی نے خود کو اہم ترین راستے سے الگ کر دیا ہے، ڈینگ نے بیرون دنیا سے مدد اور مہارت حاصل کرنے کے لیے پارٹی کی حوصلہ افزائی کی تھی، لیکن شی نے خود انحصاری پر زور دیتے ہوئے غیر ملکی دشمن طاقتوں کے خطرے سے خبردار کیا ہے، دوسرے الفاظ میں وہ ڈینگ کی پالیسی معیشت کو آزاد کردو کا استعمال کم کرتے جا رہے ہیں۔ ماضی میں پارٹی نے ترقی کرنے کے لیے جو سب سے بڑا خطرہ مول لیا تھا وہ غیر ملکی سوچ، سرمایہ کاری اور تجارت کو اپنانا تھا، اس وقت چین نے ایک غیر معمولی جوا کھیلا تھا، حالانکہ وہ شمالی کوریا کی طرح تنہا تھا، اس ترقی کے لیے چین نے غیر معمولی قیمت بھی ادا کی ہے، چین دنیا میں گلوبلائزیشن کی لہر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عالمی کارخانے کے طور پر ابھرا، چین نے کچھ پابندیوں کے ساتھ انٹرنیٹ کو اپنا لیا، جس نے اس کو ٹیکنالوجی کا لیڈر بننے میں مدد کی، غیر ملکیوں کے مشوروں سے چین نے اپنے بینک اور قانونی نظام کو از سر نو تشکیل دیا اور جدید کاروباری کارپوریشنز قائم کیں، لیکن آج کل پارٹی مختلف بیانیے کو ترجیح دے رہی ہے، بے پناہ اقتصادی ترقی کو چین کی مقامی آبادی اور قیادت کی کوششوں کا نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے، یہ مغالطہ چین کی ترقی کے گرد زبردست شکنجہ کس دے گا۔ پارٹی کی جانب سے امریکا اور جاپان کے خلاف شدید پروپیگنڈا معمول کا حصہ بن گیا ہے، حالانکہ امریکا اور جاپان چین کے سب سے بڑے تجارتی شراکت ہیں اور بیجنگ کو مہارت اور سرمایہ کاری کی فراہمی کا اہم ترین ذریعے بھی ہیں۔ حقیقی گیم چینجر ٹونی لین جیسے فیکٹری منیجر ہیں، جنہوں نے چین کا پہلا دورہ ۱۹۸۸ء میں کیا تھا۔ ٹونی لین تائیوان (خانہ جنگی کے دوران چین سے الگ ہونے والا علاقہ) میں پیدا ہوئے، ان کو اسکول میں پڑھایا گیا کہ چین تائیوان کا دشمن ملک ہے، تائیوان کے وسط میں موجود ٹونی کی جوتے بنانے کی فیکٹری ۸۰ کی دہائی کے آخر میں افرادی قوت کے شدید بحران کا شکار ہوگئی۔ ٹونی کے مال کے سب سے بڑے خریدار نائیکی نے انہیں پیداواری یونٹ چین منتقل کرنے کا مشورہ دیا، جس کے بعد ٹونی نے تمام خوف کو ایک طرف رکھتے ہوئے چین کا دورہ کیا، وہ بڑی تعداد میں پرعزم اور باصلاحیت افرادی قوت دیکھ کر حیران رہ گئے، بیجنگ کے حکام بھی سرمایہ کاری کے لیے بے قرار تھے، حکام جانتے تھے کہ کس طرح ریاستی کارخانے کو مفت استعمال کرنے اور پانچ سالہ ٹیکس چھوٹ کی پیشکش کرنی ہے۔ جس کے بعد ٹونی لین نے اگلی پوری دہائی جنوبی چین میں اپنا کاروبار کھڑا کرنے میں گزار دی، وہ مہینے میں ایک بار بیوی بچوں کی دیکھ بھال کے لیے واپس گھر جاتے، اس دوران انہوں نے جوتے بنانے کے پانچ کارخانے قائم کیے، جس میں نائیکی کو سپلائی دینے والی سب سے بڑی چینی کمپنی بھی شامل تھی۔ ٹونی کا کہنا تھا کہ ''اس وقت چین کی پالیسیاں بہت شاندار تھیں، یہاں پیسہ، ٹیکنالوجی سب کچھ موجود تھا، چین سرمایہ کاری کو پانی جذب کرنے والے فوم کی طرح جذب کر رہا تھا''۔ ٹونی لین اس زبردست سرمایہ کاری کا حصہ تھے، جس نے چینی النسل علاقے ہانگ کانگ، تائیوان، سنگاپور اور مجموعی طور پر پورے چین کی ترقی میں شاندار کردار ادا کیا ہے، جس سے کئی ترقی پذیر ممالک کو بھی فائدہ ہوا۔ معاشی ماہرین کے مطابق بڑے پیمانے پر بیرونی سرمایہ کاری کے بغیر چین صرف انڈونیشیا اور میکسیکو جتنی ہی ترقی کر سکتا تھا۔ وقت چین کے ساتھ تھا، چین نے جب پالیسیاں تبدیل کیں تو تائیوان عالمی مینوفیکچرنگ کی صنعت میں انتہائی تیز رفتاری سے ترقی کر رہا تھا، چین کو تائیوان کے سرمائے، انتظامی تجربے، ٹیکنالوجی اور دنیا بھر میں موجود خریداروں کے ساتھ تعلقات کا زبردست فائدہ ہوا، تائیوان نے چین میں بھاری سرمایہ کاری کی اور اس کو عالمی معیشت سے جوڑ دیا۔ تائیوان کی حکومت طویل عرصے تک پرانے دشمن چین پر بہت زیادہ انحصار بڑھنے کی وجہ سے فکرمند رہی اور اس نے سرمایہ کاری دیگر ممالک میں منتقل کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن چین بہت سستا تھا، بہت قریب تھا، دونوں کی زبان اور ورثہ بھی ایک جیسا تھا اور بہت ساری چیزیں مشترک تھیں، ٹونی لین نے بھی تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور ویتنام میں کارخانے لگانے کی کوشش کی لیکن ان کو ہر بار چین واپس آنا پڑا۔

اب تائیوان کا طاقتور چین پر انحصار بہت زیادہ بڑھ چکا ہے اور اس پر واپس چین کا حصہ بننے کے لیے دباؤ اپنی انتہا پر جا پہنچا ہے، تائیوان کا مستقبل غیر یقینی کا شکار ہے، تائیوان کی اس خطرناک صورتحال کی بازگشت دنیا بھر میں سنی جا سکتی ہے، لوگوں کا خیال ہے کہ تائیوان نے چین میں سرمایہ کاری کرنے میں بہت جلد بازی سے کام لیا۔ چین کے حوالے سے سب سے زیادہ پشیمانی امریکا میں پائی جاتی ہے، امریکا چین کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن میں لایا، چینی مصنوعات کا سب سے بڑا خریدار بنا اور اب واشنگٹن بیجنگ پر بڑے پیمانے پر ٹیکنالوجی کی چوری کا الزام بھی لگا رہا ہے۔ ایک امریکی سرکاری اہلکار کے مطابق ''چین کی جانب سے امریکی ٹیکنالوجی کی چوری تاریخ میں دولت کی سب سے بڑی منتقلی ہے''۔ واشنگٹن میں بہت سارے لوگوں کا خیال تھا کہ تجارت سیاسی تبدیلی لاتی ہے، لیکن چین میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تجارت پر پابندیوں کے خاتمے نے پارٹی کو کمزور کرنے کے بجائے مزید مضبوط بنا دیا، چین کی ترقی بڑے پیمانے پر برآمدات کا نتیجہ ہے، چین دنیا کے کارخانے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ معاشی ماہرین کے مطابق چین کی برآمدات بڑھنے سے صرف امریکا میں بیس لاکھ نوکریاں ختم ہوئیں، جس کے نتیجے میں متاثرہ امریکی اضلاع نے صدر ٹرمپ کو ووٹ دیا۔

مخصوص دباؤ کا استعمال

بیجنگ کے وسط میں ایک اپارٹمنٹ کی پچاسویں منزل پر پرتکلف کھانے کے دوران چین کے سب سے کامیاب ریل اسٹیٹ ٹائیکون نے بتایا کہ انہوں نے تیانمن اسکوائر پر طلبہ کی زیر قیادت جمہوریت کے لیے احتجاج پر کریک ڈاؤن کے بعد کیوں سرکاری تحقیقی ادارے کی نوکری چھوڑ دی۔ وینٹون ہولڈنگ کے چیئرمین فینگ لون دنیا بھر میں اربوں ڈالر کی جائیداد کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''ایک صبح میں اٹھا تو سب بھاگ رہے تھے، میں بھی بھاگ گیا، فوجیوں کی جانب سے گولی چلانے سے قبل میں اپنی

پوری زندگی سول سروس میں گزارنے کا فیصلہ کر چکا تھا، پارٹی نے طلبہ سے ہمدردی رکھنے والوں کو نکال باہر کیا تھا، نوے کی دہائی میں فینگ نے تجارتی ادارے میں شمولیت اختیار کرلی، اس دوران چین کے سرکاری حکام نے بڑے پیمانے پر تجارتی اداروں میں شمولیت اختیار کی تھی۔ فینگ نے بتایا کہ ''اگر اس وقت آپ نے ملاقات کرکے کاروبار میں آنے کی پیشکش کی ہوتی تو ہم کبھی آپ کے ساتھ نہیں آتے، یہ محض اتفاقی واقعہ تھا، یہ مارکیٹ اکانومی کے فروغ کے لیے بلا ارادہ بنایا گیا منصوبہ تھا، حکمت عملی بدلتے رہنا ہی پارٹی کی کامیابی کی وجہ تھی۔ ماؤ کی موت کے بعد ۱۹۸۹ء کی جمہوری جدوجہد سیاسی آزادی حاصل کرنے کی سب سے طاقتور تحریک تھی، لیکن کریک ڈاؤن نے راستہ تبدیل کردیا، ملک مزید جبر اور دباؤ کا شکار ہوگیا۔ قتل عام کے بعد معیشت کو سخت نقصان پہنچا، لیکن محض تین برس بعد ہی ڈینگ نے جنوبی چین کا دورہ کیا اور پارٹی کو دوبارہ سے اصلاحات اور مارکیٹ کھولنے کی پالیسی اپنانے کے لیے راضی کیا۔ فینگ کی طرح سرکاری نوکری چھوڑنے والے لوگوں کا کردار باہر رہتے ہوئے تبدیلی کی جدوجہد میں قوم کی رہنمائی کرنا تھا، یہ نجی تجارتی اداروں میں کام کرنے والی پہلی نسل تھی۔ اب صدر شی نے دوبارہ سے جبر کا راستہ اختیار کرلیا ہے، معاشرے کو دبایا جارہا ہے، صدر تمام طاقت اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنے لیے تمام عمر اقتدار کی راہ ہموار کررہے ہیں، وہ صدارتی مدت کا تعین کرنے والی شرائط ختم کررہے ہیں۔ کیا پارٹی ایک بار پھر لوگوں کو آزادی دے گی، جیسے تیانمن اسکوائر کے واقعہ کے کچھ برس بعد کیا گیا، یا اس بار جبر کا ماحول مسلسل قائم رہے گا، اگر ایسا ہوا تو چین کی حیران کن معاشی ترقی پر اس کے کیا اثرات ہوں گے۔ خوف اس بات کا ہے کہ صدر شی چین کی ترقی سے متعلق نیا بیانیہ تشکیل دینے کی کوشش کررہے ہیں، جبر کے ماحول کو مزید سخت کیا جارہا ہے۔ پارٹی نے ہمیشہ ہی ممکنہ مخالفین کو کچلنے میں بہت تیزی دکھائی ہے، پھر چاہے وہ نوآموز اپوزیشن جماعت ہو، کوئی مقبول روحانی تحریک ہو یا کوئی نوبل انعام یافتہ نقاد ہو، کسی کو بھی بخشا نہیں جاتا، مگر کچھ معاملوں میں استثنا بھی دیا گیا، لوگوں کو ذاتی زندگیوں کے حوالے سے آزادی دی گئی، تاکہ معاشی ترقی کا عمل جاری رہے۔ انٹرنیٹ ایک مثال ہے کہ پارٹی نے کس طرح سے جدید سہولت سے فائدہ اٹھایا، عوام کو محدود حد تک انٹرنیٹ استعمال کرنے کی اجازت دی گئی، یعنی معاشی فائدہ تو اٹھایا گیا لیکن ساتھ ہی خطرے کا باعث بننے والی معلومات کی روک تھام کا انتظام بھی کرلیا، ۲۰۱۱ء میں مشرقی چین میں تیز رفتار ٹرین کے حادثے کے بعد پارٹی کے حادثے سے نمٹنے کے طریقہ کار کے حوالے سے عوام کی جانب سے سوشل میڈیا پر ۳۰ لاکھ سے زیادہ تنقیدی پیغامات بھیجے گئے، لیکن یہ پیغامات اسکرین پر نظر آنے سے قبل ہی سنسر کردیے گئے۔ یہاں تک کہ شدید پریشانی سے دوچار سرکاری حکام نے مقبول ترین چینی سوشل میڈیا سائٹ ویبو کو بند کرنے کا فیصلہ کرلیا، لیکن وہ عوام کے ردعمل سے سخت خوفزدہ تھے، آخر میں انہوں نے ویبو کو کھلے رہنے دیا لیکن ساتھ ہی سوشل میڈیا سائٹ پر کنٹرول بڑھانے کے لیے سرمایہ کاری میں بہت زیادہ اضافہ کردیا اور کمپنیوں کو بھی کنٹرول بڑھانے کا حکم دیا گیا۔ اس پالیسی نے کام کر دکھایا، بہت سی کمپنیوں نے سنسر شپ کے کام کے لیے سیکڑوں ملازمین بھرتی کرلیے اور چین انٹرنیٹ کی عالمی دنیا میں بڑی طاقت بن کر ابھرا، آن لائن سنسر شپ کے لیے ادا کی گئی قیمت انٹرنیٹ سے پہنچنے والے فائدے کے مقابلے میں بہت معمولی تھی۔ انٹرنیٹ انڈسٹری کی بنیاد رکھنے والے چن ٹونگ کا کہنا ہے کہ ''معاشی ترقی کے لیے ضروری معلومات ہم اب بھی حاصل کررہے ہیں''۔

نیا دور

چین واحد ملک نہیں جس نے آمرانہ طرز حکومت پر قائم رہتے ہوئے فری مارکیٹ کی ضروریات کو اپنایا، لیکن چین طویل عرصے اور بڑے پیمانے پر اس نظام پر کاربند رہا، جس کے نتائج بھی بہت شاندار رہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا چین اس نظام کو برقرار رکھتے ہوئے امریکا کے شراکت دار کے بجائے دشمن کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔ تجارتی جنگ تو صرف ایک آغاز ہے اور تجارتی جنگ ہی صرف وجہ تنازعہ نہیں، امریکا کے جنگی جہاز متنازع سمندری علاقوں میں چینی دعوے کو چیلنج کرتے رہتے ہیں، چین کی جانب سے مسلسل فوجی اخراجات میں اضافے کے باوجود امریکی جنگی جہاز متنازع سمندری علاقے میں آمدورفت جاری رکھے ہوئے ہے، اس کے ساتھ ہی واشنگٹن دنیا میں بڑھتے ہوئے چینی اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اقدامات بھی کررہا ہے، امریکا نے انتباہ جاری کیا ہے کہ عالمی انفرااسٹرکچر کے لیے آنے والی چینی سرمایہ کاری کے ساتھ کئی نقصانات بھی جڑے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ چین اور امریکا کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں، لیکن امریکا کے ہر طبقے میں چین کو متبادل عالمی نظام کے چیمپئن کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، ایک ایسا ملک جو آمرانہ رویے کو گلے لگائے ہوئے ہے اور ساتھ ہی غیر منصفانہ مقابلے کو فروغ دے رہا ہے، انتہائی حد تک بٹے ہوئے امریکا میں چین کے بارے میں غیر معمولی اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔

دوسری جانب صدر شی چن چینی قوم کی عظیم نشاۃ ثانیہ کے اپنے تصور سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہیں، صدر شی چن کے کچھ ساتھی ۲۰۰۸ء کے مالیاتی بحران کے بعد سے امریکا کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ٹرمپ انتظامیہ کی پالیسی کو اپنے خدشات کا ثبوت سمجھتے ہیں، ان کے خیال میں امریکا مسلسل چین کو نیچا دکھانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ اس دوران نئی نسل میں بھی بے چینی بڑھتی جارہی ہے، کیونکہ چینی طویل عرصے تک امریکا سے شدید متاثر رہے ہیں اور ان میں احساس بڑھ رہا ہے کہ پارٹی کسی مرحلے پر ناکام بھی ہوسکتی ہے۔ خوشحالی نے چین میں لوگوں کی توقعات کو بھی بڑھا دیا ہے، عوام معاشی ترقی کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتے ہیں، قوم صاف ہوا، محفوظ کھانا اور دوا، صحت اور تعلیم کی بہتر سہولیات، کرپشن میں کمی اور زیادہ مساوات کی خواہش مند ہے، پارٹی عوام کی توقعات پورا کرنے کی جدوجہد کررہی ہے، جس کے لیے حکام کی کارکردگی بڑھانے اور جانچنے کے لیے رپورٹ تیار کی جاتی ہے، ان رپورٹس کے مطابق حکام کی کارکردگی اہداف کو حاصل کرنے کے مقابلے میں ناکافی ہے۔ ایک ریٹائرڈ سرکاری ملازم کا کہنا ہے کہ ''بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ترقی کس کے لیے کی جائے، ہم اس مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہے۔ ترقی کا عمل سست رفتار ہے، اس کے اثرات لمبے عرصے میں معیشت کی بہتری کی شکل میں سامنے آئیں گے، لیکن اس سے عوام کے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے، پارٹی قوم کو درپیش چیلنجز پر بحث کو کنٹرول اور سنسر کرنے کے لیے پہلے سے بہت زیادہ خرچ کررہی ہے، چین کو بڑھتی ہوئی عدم مساوات، قرض کی خطرناک سطح اور عمر رسیدہ افراد کی بڑی تعداد جیسے چیلنجوں کا سامنا ہے۔ صدر شی چن خود تسلیم کرچکے ہیں کہ قوم نئے دور میں داخل ہوچکی ہے، جس کے لیے پارٹی کو بھی نئے طریقے اپنانا ہوں گے، لیکن ان کی پالیسی بھی ماضی کی طرح جبر کو مزید بڑھانا ہے، جس میں مسلم اقلیت کے خلاف وسیع پیمانے پر حراستی مراکز کا قیام بھی شامل ہے۔ چین نے آزاد معیشت کی پالیسی کو تبدیل کرتے ہوئے دیگر ممالک کو بھاری قرضے دینے شروع کردیے ہیں، نقادوں کا کہنا ہے

باقی صفحہ نمبر ۶

شام کی خانہ جنگی۔۔حتمی مرحلہ یا ایک نیا آغاز۔۔

Robert S. Ford

(پہلی قسط)

تعارف:

شام میں خانہ جنگی اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے اور صدر بشارالاسد کی حکومت بڑی حد تک اس جنگ میں کامیاب ہو چکی ہے۔ مستقبل قریب میں تو حکومت کی باگ ڈور بشار کے ہاتھ میں ہی ہوگی۔ دریں اثنا ٹرمپ انتظامیہ مارچ ۲۰۱۹ء میں امریکی فوج اور ''کرد اتحادیوں'' کے ساتھ مل کر جنوب مشرقی شام کے آخری حصے کو داعش کے قبضے سے آزاد کروانے کی خوشخبری سنا رہی تھی۔ تاہم مشرقی شام میں داعش کا خاتمہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ شام کا تنازع حل ہو گیا ہے۔

ملک میں مختلف حصوں پر قبضے کی جنگ تین ''مراحل'' پر مشتمل تھی۔ پہلے مرحلے میں اسد حکومت نے ایران اور روس کی مدد سے ملک کے جنوبی حصے میں، جہاں کی آبادی بھی زیادہ ہے، اپنا کنٹرول مستحکم کر لیا ہے۔ بشار حکومت ملک کے بقیہ دو حصوں کا کنٹرول حاصل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، جو کہ فی الحال حزب اختلاف کی مسلح ملیشیا کے کنٹرول میں ہیں جنہیں غیر ملکی حمایت حاصل ہے۔

ملک کے شمال مغربی علاقے میں حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان ''فائر بندی'' کے معاہدے کی نگرانی ترک فوج کر رہی ہے۔ اور لگتا یہ ہے کہ شامی حکومت یہاں (ادلب میں) بھی قبضے کے حصول کے لیے روسی فوج کی مدد سے آپریشن کا آغاز کر دے گی، جس کے نتیجے میں ایک دفعہ پھر لوگوں کی بڑی تعداد کو نقل مکانی پر مجبور ہونا پڑے گا۔

مشرقی شام میں ''کرد'' اور ''عرب'' گروپ امریکی فوج کی مدد سے زیر قبضہ علاقے کا انتظام چلا رہے ہیں اور اس علاقے کو امریکا نے ''نو فلائی زون'' قرار دیا ہے، جس سے اس گروہ کو مزید مدد ملتی ہے، یاد رہے کہ اس علاقے کو کردوں نے داعش سے آزاد کروایا تھا۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی طرف سے ۲۰۱۸ء کے آخر میں شام سے انخلا کے اعلان نے کردوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بشار حکومت سے مذاکرات کریں تاکہ امریکی فوج کے نکلنے کے بعد مشرقی شام کے اس علاقے میں شامی فوج کی تعیناتی ممکن بنائی جا سکے۔ امریکی فوج کے انخلا کے بعد شامی حکومت یہاں بھی مقامی گروہوں کے ساتھ مل کر اپنا کنٹرول قائم کر لے گی۔ شامی حکومت اور اس کے اتحادی کسی بھی صورت میں ملک کی تقسیم کو قبول نہیں کریں گے۔ یہ اپنی کوششیں جاری رکھیں گے کہ امریکی اور ترک فوج کے کنٹرول میں موجود علاقوں میں بھی مرکزی حکومت کی رٹ قائم کی جائے۔

شامی تنازعے کا مستقل حل ان زونز کے مستقبل کے حوالے سے مذاکرات میں پوشیدہ ہے۔ اور ان مذکرات میں شامی حکومت اپنی ''رٹ'' قائم کرنے کے بدلے میں روس، ترکی اور حزب اختلاف کے گروہوں کی شرائط کو قبول کرے گی۔ اس عمل کو مکمل ہونے میں کئی سال لگ سکتے ہیں، تاہم لڑائی اور تشدد کی لہر برقرار رہے گی، البتہ اس میں پہلے کی سی تیزی نہیں رہے گی۔

دمشق حکومت اس بات کی اہلیت رکھتی ہے کہ وہ تمام علاقوں کا کنٹرول دوبارہ حاصل کر لے لیکن اس کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ وہ تباہ شدہ معیشت کو دوبارہ پٹری پر لا سکے۔ آنے والے سالوں میں مغربی پابندیوں، فنڈ کی کمی اور تباہ شدہ علاقوں کی تعمیر نو جیسے چیلنجوں سے نمٹنا شامی حکومت کے لیے مشکل کا باعث ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ انتہا پسندوں کے حملے بھی وقتاً فوقتاً جاری رہیں گے۔ جس کے نتیجے میں پچاس لاکھ شامی مہاجرین کو شام واپس آنے پر بھی مناسب حالات کا سامنا کرنا پڑے گا اور شامی حکومت مستقبل میں بھی کمزور ریاست کے طور پر ہی دنیا کے نقشے پر موجود رہے گی۔

تنازع کا آغاز، ۲۰۱۱ تا ۲۰۱۴ء

تیونس اور مصر میں کامیاب عوامی مزاحمت کو دیکھتے ہوئے مارچ میں شام کے عوام نے بھی حکومت کے ظلم و زیادتی اور بدعنوانی کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے۔ چند ایک واقعات کے علاوہ مجموعی طور پر مظاہرے پُرامن طریقے سے جاری تھے۔ شامی حکومت نے مظاہرین کو گرفتار کرنا شروع کیا اور مظاہرین پر تشدد کا آغاز کر دیا، جس سے مظاہروں کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ حکومت کے جارحانہ ردعمل نے تنازع کو ہوا دی اور ریاست کے اس طرزِ عمل نے ملک کو خانہ جنگی کی طرف دھکیل دیا۔ مصر اور تیونس میں عرب بہار کے نتائج شام میں خانہ جنگی کی بڑی وجہ بنے۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۶ء سے ۲۰۱۰ء تک شام میں آنے والے قحط پر شامی حکومت کے اقدامات کے خلاف غم و غصہ بھی ایک بڑی وجہ بنا۔ ۲۰۱۱ء کے موسم گرما میں دمشق کے مضافاتی علاقوں میں مظاہرے شروع ہوئے۔ بڑے شہروں کے گرد رہنے والے غریب لوگوں کی جانب سے مظاہروں میں شرکت یقینی تھی۔

۲۰۱۱ء کے موسم سرما تک مظاہرین اور باغی بہت سے شہر اور دیہی علاقوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ جس کا جواب شامی حکومت بھی ٹینکوں اور جہازوں کے ذریعے دے رہی تھی۔ اور آنے والے مہینوں میں اس لڑائی نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی تنازع کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی چلی گئی، وہ لڑائی جو حکومت کے احتساب کے لیے لڑی جا رہی تھی، وہ اب تبدیل ہو کر طاقت کے حصول کی جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ اس لڑائی میں فرقہ واریت کا عنصر بڑھتا چلا گیا کیوں کہ حزب اختلاف کی جانب سے لڑنے والوں میں سنی انتہا پسندوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ۲۰۱۲ء میں حاصل ہونے والی ابتدائی کامیابیوں کے بعد حزب اختلاف کو اسلحہ اور دیگر وسائل کی کمی کا سامنا کرنا پڑا، جس سے ان کی کامیابیوں کا سفر بھی رک گیا اور مذاکرات کی راہ ہموار ہونے لگی۔ ۲۰۱۳ء تا ۲۰۱۵ء شامی حکومت اور مسلح حزب اختلاف میں زیر قبضہ علاقوں کا تبادلہ نہ ہونے کے برابر رہا۔

مغربی حکومتوں کو شام میں ہونے والی خوں ریزی نے حیران کر دیا۔ پھر انھیں یہ خوف لاحق ہوا کہ اس خانہ جنگی سے حزب اختلاف کی تنظیموں میں انتہا پسندی بڑھنے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس صورتحال کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے ایک ''متحدہ قومی حکومت'' کا منصوبہ پیش کیا اور اسی سلسلے میں ترکی اور چند خلیجی ممالک کی مدد سے حزب اختلاف کی تنظیموں کو محدود امداد کی فراہمی بھی شروع کر دی تاکہ بشار کو مذاکرات کی میز پر لایا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی ایران نے بھی ہزاروں غیر ملکی شیعہ عسکریت پسندوں کو بشار حکومت کی مدد کے لیے شام کے محاذ پر اتار دیا۔ ۲۰۱۵ء میں روس نے کمزور ہوتی بشار حکومت کی مدد کے لیے فضائی آپریشن کا آغاز کر دیا۔

۲۰۱۱ء تک مغرب کا موقف تھا کہ شام کے مسئلے کا غیر فوجی حل تلاش کیا جائے، لیکن یہ حکمت عملی ناکام ہو گئی۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا اگر دونوں فریقین ایک جیسی طاقت رکھتے ہوں۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں نے بشار کی مخالفت تو کی لیکن ایران اور روس کا مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا۔

جس کی وجہ سے طاقت کا توازن بشار کے حق میں ہوتا چلا گیا۔ فوجی مداخلت کی دھمکی کے بغیر بشار حکومت کو مذاکرات کی میز پر لانے کی امریکی حکمت عملی بری طرح سے ناکام ہوئی۔ اس کے مقابلے میں شامی فوج نے ایرانی ملیشیا کی زمینی مدد اور روسی فضائیہ کی مدد سے نہ صرف جنوبی شام کے علاقوں کو دوبارہ اپنے قبضے میں لینا شروع کر دیا بلکہ حزب اختلاف کے کمزور ہوتے گروہوں کو کافی پیچھے دھکیل دیا۔ واشنگٹن اس صورت حال سے لاتعلق ہو گیا تھا، پھر ۲۰۱۴ء میں امریکا کی توجہ کا مرکز ''داعش'' بن گئی، جو مشرقی شام اور جنوبی عراق کے بڑے علاقے پر قبضہ کر چکی تھی۔

۲۰۱۵ء تا ۲۰۱۸ء جنگ کے محرکات:

جنوبی شام میں شامی حکومت:

تنازع کے آغاز سے ہی شامی حکومت نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ اسے نسبتاً منظم کمانڈ اور بہتر انفراسٹرکچر کی مدد حاصل رہی ہے اور آج کے دن تک اس نے ریاست کی حیثیت سے کام کیا ہے، اگرچہ جنگ کی وجہ سے حکومت کافی کمزور ہو چکی ہے۔ صدر بشار الاسد کو اپنی فوج اور چار بے رحم خفیہ ایجنسیوں کی مستقل مدد حاصل رہی ہے۔ بشار نے مسلسل اس بات پر زور دیا ہے کہ تمام بڑے اداروں کا کنٹرول اپنے پاس رکھے اور حزب اختلاف کے ساتھ کسی بھی قسم کے اختیارات کی تقسیم کو یکسر مسترد کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے حزب اختلاف کے کنٹرول میں چلے جانے والے علاقوں کے دوبارہ حصول کے لیے مستقل جدوجہد جاری رکھی۔ شامی حکومت کا انحصار اپنے اتحادی روس اور ایران پر ہے اور اس نے اس بات کا بھی اشارہ دیا ہے کہ دونوں ممالک کی فوجیں طویل مدت کے لیے شام میں رہیں گی۔ دمشق اکثر امداد کے معاملے میں ڈالے جانے والے روسی دباؤ کو مسترد کر کے اپنی حیثیت کا اعلان کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اکثر ایران کو کھلے عام تنقید کا نشانہ بناتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ ابھی بھی اپنی الگ حیثیت رکھتا ہے۔ شامی حکومت میدان جنگ میں تو اتنی مضبوط ہے کہ اسے میدانِ جنگ میں شکست نہیں دی جا سکتی ہے۔ لیکن مستقل جنگ لڑنے کی وجہ سے نہ صرف افرادی قوت کی کمی کا شکار ہو گئی ہے بلکہ مالی حالات بھی بہت خراب ہیں۔ افرادی قوت کی کمی کی وجہ سے حکومت نے مقامی قبائلی سرداروں اور جنگجوؤں سے بھی مدد حاصل کی، جنھوں نے حکومت کی مدد کے بدلے میں اپنے علاقوں میں کھلے عام اسمگلنگ اور لوٹ مار شروع کر دی۔

شامی حکومت نے جنوبی اور مشرقی شام میں کسی حد تک اپنی جنگی حکمت عملی اور روسی اور ایرانی مدد سے اپنی سبقت برقرار رکھی۔ دمشق نے ماسکو کی مدد سے مقامی عسکریت پسندوں سے کامیاب مذاکرات کیے، جن میں درحقیقت یہ طے پایا کہ عسکریت پسند ہتھیار ڈالیں گے۔ زیادہ آبادی والے شہروں پر حکومت نے اپنا کنٹرول مضبوط کر لیا، ان شہروں میں دمشق، الیپو، حمص، لتاکیا اور حما وغیرہ شامل ہیں۔ شامی حکومت نے اس دوران اپنے غیر ملکی اتحادی اور کاروباری افراد کے ذریعے دیگر عرب ریاستوں سے بھی تعلقات بہتر کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ اس کے علاوہ شامی حکومت نے پچاس لاکھ مہاجرین کو واپس لانے کے لیے جارحانہ کوششیں کرنے کے بجائے اپنے وفادار کاروباری افراد کو زمینیں الاٹ کرنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھی تاکہ وہ اپنے کاروبار میں اضافہ کر سکیں۔ شام کے تنازع کے حل میں حکومت اور حزب اختلاف کی باہمی شرائط اور معاہدہ ہی کارفرما نہ ہوگا بلکہ اپنے اپنے مفادات رکھنے والی علاقائی اور عالمی طاقتوں کی مداخلت اور اس کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی عسکریت پسندی بھی اپنا کردار ادا کرے گی۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"The Syrian civil war: A new stage, but is it the final one?" ("mci.edu". April 2019)

بقیہ: چین: ناکامی کو شکست!

کہ بھاری قرضوں کی آڑ میں چین دوسرے ممالک کی سیاست میں مداخلت کر رہا ہے، ادھر گھر میں بھی پرانی سیاسی پالیسی پر قائم رہتے ہوئے نئی سوچ کے لیے راہیں بند کر دی گئی ہیں۔ صدر شی چن کو بظاہر یقین ہے کہ چین کی کامیابی بہت شاندار ہے، اس لیے پارٹی دوبارہ سے انتہائی آمرانہ رویہ اختیار کر سکتی ہے، کیوں کہ اپنا وجود برقرار رکھنے اور امریکا سے آگے بڑھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ یقینی طور پر وقت بھی پارٹی کے ساتھ ہے، گزشتہ چار دہائیوں کے دوران چین نے امریکا کے مقابلے میں دس گنا زیادہ رفتار سے اقتصادی ترقی کی ہے، اب بھی چین کی معاشی ترقی کی رفتار امریکا سے دگنی ہے، بظاہر پارٹی کو وسیع پیمانے پر عوامی حمایت بھی حاصل ہے اور دنیا بھر میں بہت سارے لوگوں کو یقین ہے کہ ٹرمپ کا امریکا زوال پذیر ہے جبکہ چین کے دور کا ابھی صرف آغاز ہوا ہے۔ لیکن ایک بار پھر چین دنیا کی توقعات پر پورا اترنے سے انکار کر رہا ہے۔

(ترجمہ: سید طالوت اختر)

"The land that failed to fail".
("New Yrok Times". Nov. 18, 2018)

آراء قارئین

محترم ایڈیٹر ''معارف فیچر''

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ماشاء اللہ اس دفعہ بھی پندرہ روزہ معارف ''فیچر'' کراچی یکم جون ۲۰۱۹ء کا شمارہ بڑا شاندار ہے جس میں بہت اچھے اور دلچسپ معلوماتی مضامین ہیں۔ خاص طور پر ''چین: ناکامی کو شکست'' ''بھارت چین کے تعلقات میں اُتار اور چڑھاؤ''، ''امریکا چین تجارت یا سیاست؟'' بہترین مضامین ہیں جن میں چین کی ترقی کی داستان، اس کی خارجہ پالیسی اور انڈیا اور امریکا کے ساتھ تعلقات کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ''بجٹ پاکستان کا خسارہ نہیں بلکہ اعتماد کا خسارہ ہے'' چیئرمین ایف بی آر شبر زیدی سے گفتگو بھی پاکستان میں ٹیکس وصولی کے نظام کے حوالے سے بہترین مضمون ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ جو ٹیکس دیتا ہے وہ ہی پھنستا ہے جو ٹیکس نہیں دیتا وہ مزے کر رہا ہے کوئی اسے پوچھنے والا تک نہیں۔

اس شمارے میں بھی یعقوب خان بنگش کا مضمون ''پاکستان میں جامعات کا نظام'' اچھا لگا، لیکن یونیورسٹی انتظامیہ اور اساتذہ کی یونینز کی وجہ سے وہاں کوئی احتساب کا عمل موجود نہیں ہے۔ یونیورسٹیوں کو چلانے کے لیے ہمارے صنعتی شعبے کو خاص دلچسپی لینی چاہیے اور اس کے علاوہ فکری، نظریاتی اور تاریخی نقطہ نظر سے ہمارے دانشورانِ ملت کو بھی آگے بڑھنا چاہیے۔

میری خواہش ہے کہ یہ ''معارف فیچر'' کے مضامین پاکستان کی دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کر کے شائع کروائے جائیں، اس سلسلے میں انڈس کالج لائبریریز نیٹ ورک اسلام آباد آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ میری طرف سے جناب منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون اور غیاث الدین و دیگر معارف فیچر ٹیم کے اراکین اور خاص طور پر ہمارے محسن برادرم سید منور حسن صاحب کو سلام عرض کیجیے گا۔

آغا نور محمد پٹھان۔۔

چیف کوآرڈینیٹر۔ انڈس کالج لائبریریز نیٹ ورک اسلام آباد

ٹرمپ، اِخوان المسلمون اور دہشت گردی

محمد عبداللہ

صدر ٹرمپ مشرق وسطیٰ کے لیے جو عزائم رکھتے ہیں اس کی ایک مثال ماہ اپریل میں جنرل سیسی کے مطالبے پر اخوان المسلمون کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے کی صورت میں منظر عام پر آئی۔

۹/اپریل کو جنرل سیسی نے اپنے امریکا کے دورے کے دوران صدر ٹرمپ سے اخوان المسلمون کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے کا دیرینہ مطالبہ دوبارہ پیش کیا اور بدلے میں فلسطین سے متعلق (Deal of the Century) صفقۃ القرآن کی مکمل حمایت کی یقین دہانی کروائی۔ جس کے نتیجے میں ۳۰/اپریل کو امریکی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ اخوان المسلمون کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے کی باضابطہ کارروائی کا آغاز کر رہی ہے اور جلد ہی اخوان المسلمون کو عالمی دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل کر دیا جائے گا۔

اس سے پہلے جنرل سیسی امریکا میں صدر بش اور صدر اوباما کے ادوارِ حکومت اور ۲۰۱۵ء میں برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون کے دورِ حکومت میں اخوان المسلمون کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے کی ناکام کوششیں کرتے رہے ہیں۔ اب ٹرمپ سرکار کو سب سے پہلے امریکی خفیہ اور سیکورٹی اداروں کی مدد سے اخوان کے خلاف شواہد کی دستاویز تیار کرنا ہوگی، جس کے بعد سیکرٹری آف اسٹیٹ، اٹارنی جنرل سے مشورے کے بعد اخوان کو دہشت گرد تنظیم قرار دے سکیں گے۔ اس کے بعد امریکی کانگریس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ سات دن کے اندر اندر ٹرمپ سرکار کے اس فیصلے کو بلاک کر سکتی ہے۔ نیز اخوان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تیس دن کے اندر اندر امریکی وفاقی عدالت میں اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر سکتے ہیں۔ ''سیاسی اسلام'' کے مخالفین اور اخوان المسلمون کے شدید ترین ناقدین بھی صدر ٹرمپ کے اس فیصلے پر سر پیٹ کر رہ گئے ہیں۔

خود امریکی مبصرین کے مطابق امریکی پالیسیوں کی شدید مخالفت کے باوجود اخوان بہت سے مواقع پر امریکی پالیسیوں کے لیے بالواسطہ بہت مفید رہے ہیں۔ صدام حسین کا تختہ الٹنے کے بعد عراق میں امریکا کا شروع کیا گیا سیاسی و جمہوری عمل اخوان کی ہی مرہون منت معرض وجود میں آیا اور آج بھی اخوان کے ہی تعاون سے کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے۔ عراق میں القاعدہ اور داعش جیسی دہشت گرد تنظیموں کے خلاف عسکری مہمات میں بھی اخوان کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ اخوان القاعدہ یا داعش کی طرز پر چند سو یا ہزار افراد پر مشتمل تنظیم نہیں، بلکہ ایک ایک ملک میں اس کے ارکان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے جبکہ اس کے ہمدرد اور حامیوں کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہے۔ ایسے میں پوری دنیا میں پھیلے کروڑوں افراد کو یکلخت دہشت گرد قرار دینا سمجھ سے باہر ہے۔

اسی طرح بہت سے امریکی اتحادی ممالک جیسے بحرین، مراکش، اردن، یمن، لیبیا اور ترکی وغیرہ میں قائم حکومتیں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ اخوان سے منسلک ہیں یا ان ممالک کی پارلیمانی نشستوں پر اخوان قابل ذکر تعداد میں براجمان ہیں۔ کیا ان ریاستوں میں قائم حکومتوں اور ان میں موجود پارلیمان کو بھی دہشت گرد قرار دیا جائے گا؟

کارنیگی انڈومینٹ فار پیس کے مطابق اخوان المسلمون کو دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل کر دیا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں:

☆ اخوان کے ارکان پر امریکا میں داخلے پر پابندی ہوگی۔

☆ ان کے تمام اثاثے منجمد کر دیے جائیں گے۔

☆ اخوان المسلمون سے کسی بھی قسم کا رابطہ کرنا یا مشورہ لینا دہشت گردی پر محمول کیا جائے گا۔

☆ اخوان المسلمون کے کسی رکن کا انٹرویو کرنا، ان کا بیان یا موقف لوگوں تک پہنچانا، کسی اخوانی کی تحریر یا تقریر کا ترجمہ کرنا، یہ سب دہشت گردی کی Meterial Support گردانا جائے گا۔

ییل یونیورسٹی (Yale University) میں سیاسی علوم کے پروفیسر اینڈریو مارچ کے مطابق دہشت گردی کی ایسی وسیع تعریف سے خود امریکی صحافیوں اور محققین کو خطرہ لاحق ہے کیونکہ ماضی میں اخوانی رہنماؤں سے کیے گئے انٹرویوز اور اخوان پر لکھے گئے ڈاکٹریٹ کے مقالاجات کے دوران جو میل ملاپ یا تراجم مختلف امریکی صحافی، طلبہ اور پروفیسرز نے اب تک کیے ہیں وہ ان کے دہشت گرد گردانے جانے کے لیے کافی ہے۔

خود امریکی تھنک ٹینکس اور مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ اخوان جیسی پرامن اور جمہوری تنظیم کو دہشت گرد قرار دینے سے الٹا دہشت گردی کو ہوا ملے گی اور عرب اسٹریٹ کو ایک غلط پیغام جائے گا کہ تبدیلی کا کوئی پُرامن راستہ کارگر ثابت نہیں ہوسکتا۔ کارنیگی انڈومینٹ فار پیس سے وابستہ امریکی محقق میچل ڈیون کے بقول: ''اگر ہم چاہتے ہیں کہ نوجوان عسکریت کی بجائے پُرامن طریقہ اپنائیں تو میرا نہیں خیال کہ اخوان کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے سے زیادہ اُلٹا اقدام کوئی ہوسکتا ہے''۔

امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے انسداد دہشت گردی کے سابق کوآرڈینیٹر ڈینیل بنجمین نے ۲۰۱۷ء اور ۲۰۱۸ء میں اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے تحت اخوان کے دہشت گردی میں ملوث ہونے پر تحقیقات کروائیں اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اخوان کو دہشت گرد قرار دینے کے لیے کسی بھی قسم کے شواہد موجود نہیں ہیں۔ وہ آج بھی اپنی اس بات پر قائم ہیں کہ اخوان کو دہشت گرد تنظیم قرار دینا غیر قانونی عمل ہوگا اور ان کے مطابق اس کارروائی کا واحد مقصد ٹرمپ کا اپنا نسل پرست اور اسلاموفوبک ووٹ بینک مضبوط کرنا ہے:

"There is no question that there has been an effort to meet the appetites of Trump's very Islamophobic base"

امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے ایک اور سابق آفیسر جیسن بلیزکس کے مطابق اخوان صرف ایک بہانہ ہے، اصل مقصد امریکا میں موجود تمام اسلامی تنظیموں کو نشانہ بنانا ہے۔

خود امریکا میں اخوان کا بہت وسیع نیٹ ورک موجود ہے اور سیکڑوں مساجد، اسلامک اسکولز، کاروبار اور انسانی حقوق کی بیسیوں تنظیمیں اخوان سے وابستہ افراد چلا رہے ہیں۔ اسی طرح امریکی جامعات، اسپتالوں اور کاروباری مراکز، لاء فرمز میں لاتعداد اخوانی پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر اور وکلا اپنی پیشہ وارانہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

پچھلے کئی سالوں سے امریکی نسل پرست اپنے سیاسی مخالفین اور بالخصوص امریکا میں موجود مسلم کمیونٹی کی نمایاں شخصیات پر 'اخوان المسلمون' کا لیبل لگا کر اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے میں سرگرداں ہیں۔ ماضی میں ہیلری کلنٹن کی قریبی ساتھی ہما عابدین اور خضر خان کے والد کو بھی صدر ٹرمپ نے ایسے ہی پروپیگنڈے کا نشانہ بنایا تھا۔ اسی طرح فروری ۲۰۱۲ء میں ٹرمپ نے خود صدر اوباما پر بھی اخوان المسلمون کی فنڈنگ کا مضحکہ خیز الزام لگایا تھا۔ ان کا کہنا تھا:

"Barack Obama's budget funds the "Arab Spring" with 800B$ and the Muslim Brotherhood in Egypt 1.3B$ in military aid. He loves radical Islam."
"Obama now wants to give another 450mS to the Muslim Brotherhood. Money we don't have going to people that hate hate us. Moronic."

صدر ایردوان کے قریبی ساتھی اور معروف سیاست دان، یاسین اقطای کے مطابق اخوان پر پابندیاں لگانے کا یہ عمل خود امریکا کی ساکھ کے لیے دھچکا ثابت ہوگا اور ''اندیشہ ہے کہ یہ اقدام اخوان کے خلاف نہیں بلکہ اسلام کے خلاف جنگ تصور کیا جائے گا''۔

اس سب معاملے کو اخوان کس نظر سے دیکھ رہے ہیں، اس سلسلے میں ترکی کی اناضول خبر رساں ادارے نے حال ہی میں اخوان المسلمون کے نائب مرشد عام الاستاذ ابراہیم منیر سے انٹرویو کیا، جس کا کچھ حصہ پیش خدمت ہے۔

س: ٹرمپ کے اخوان المسلمون کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے کے متوقع فیصلے کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: ظاہری بات ہے ہم امریکا کے اس موقف کا خیر مقدم نہیں کرتے اور ہمارے لیے یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ امریکی انتظامیہ ٹرمپ کے اس اعلان پر عمل کرتے اخوان کو دہشت گرد تنظیم قرار دے دے۔ ابھی تک ہم نے قانونی چارہ گوئی کی طرف پیش رفت نہیں کی ہے۔ فی الوقت ہم ایک بھرپور سفارتی مہم کی تیاریوں میں ہیں، جس کے تحت ہم واشنگٹن اور وہاں موجود مقتدر حلقوں کو متحرک کرسکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم عالمی سطح پر ایک مہم کی تیاریوں میں مصروف ہیں، جس کے تحت اخوان المسلمون کی اس دنیا میں امن سلامتی اور انسانی بھائی چارے کے فروغ کے لیے گراں قدر خدمات کو اجاگر کیا جائے۔

س: ۳ر جولائی ۲۰۱۳ء کے بعد سے اخوان المسلمون دوبارہ پچاس کی دہائی میں چلے گئے ہیں۔ مقدمے، پھانسیاں اور اب دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں نام، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اخوان ایک بار پھر مذمتی بیانات وغیرہ دے کر اس چیلنج سے نبرد آزما ہو جائیں گے خصوصاً جبکہ آج ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں؟

ج: پہلی بات تو یہ ہے کہ اخوان کے ساتھ حکومتوں کی جانب سے جو کچھ ہوا اور جو ہو رہا ہے، ایک دنیا جانتی ہے کہ یہ وہ حکومت ہے، جو ہر قانون اور دستور سے خود کو مبرا قرار دیتی ہے اور اس کے تمام اعمال کا نتیجہ تا حال بجز تباہی کے اور کچھ نہیں۔ یہ تمام واقعات فی ذاتہ جماعت کے صدق وصفا کی دلیل اور ہر طرح کے فسادات کو رد کر دینے کا ثبوت ہیں اور اسی وجہ سے یہ نظام ان سے محاذ آرا ہے۔

دوسرا یہ کہ دنیا اب بدل رہی ہے اور تاریخ کسی ایک واقعہ پر آ کر رک جانے والی نہیں، ایک وقت تھا جب بدعنوان حکومتوں کی پالیسیوں کے بارے میں کھوج لگانا مشکل تھا مگر آج کے دور میں اس کے ارادوں اور چالوں کا پردہ فاش کرنا خاصا آسان ہو گیا ہے اور بہر کیف اکیسویں صدی ہمارے لیے بیانات جاری کرنے یا الزامات کی تردید کرنے میں مانع نہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ اخوان کے خلاف جاری مہم ان تک محدود نہیں بلکہ اس کا مقصد دین کو عبادت گاہوں تک محصور کر دینا ہے اور ان عبادت گاہوں میں بھی جو بھی وعظ و نصیحت ہو اس پر بھی حکومتی سیکورٹی اداروں کا مکمل کنٹرول ہو اور ایسے ہر سیاسی اور سماجی کام پر پابندی ہو، جو قرآن وسنت کے صحیح فہم پر مبنی ہو۔ یہ کارروائیاں درحقیقت شروعات ہیں، امت مسلمہ کی خواب غفلت سے بیداری کی اور اس جدید شیطانی منصوبے کی اللہ کی زمین پر ناکام و نامراد ہو جانے کی، جس سے دینی حمیت کی ایک نئی لہر جنم لے گی۔

س: رمضان کے بعد آپ ''صفقۃ القرآن'' کے تناظر میں حالات کو کس کروٹ بیٹھتا دیکھ رہے ہیں؟ کیا آپ اس مزاحمت کے خلاف موقف اختیار کریں گے یا واشنگٹن سے دہشت گردی کا لیبل لگائے جانے کے ڈر سے خاموشی کا لبادہ اوڑھ لیں گے؟ یا آپ اس کی مزاحمت کریں گے اور اگر ایسا ہے تو اس ضمن میں آپ کی حکمت عملی کیا ہوگی؟

ج: یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ جسے یہ صفقۃ القرآن کا نام دے رہے ہیں، وہ دراصل ایک تباہ کن منصوبہ ہے جو ماضی کے سائیکس پیکو معاہدہ سے مطابقت رکھتا ہے اور اب وہ بزور طاقت اس کو اس خطے پر مسلط کرنا چاہ رہے ہیں اور یہ چیلنج خطے میں موجود تمام اسٹک ہولڈر۔ جماعتیں اور ممالک۔ کو درپیش ہے اور اخوان بھی ان Stakeholder میں سے ایک ہیں اور اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ ہر قیمت پر اپنے اقدار کا تحفظ کریں۔

اس منصوبے کی سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ حکومتی سرپرستی کے تحت نوجوانوں کی کسمپرسی کو مزید ہوا دینے کے لیے دین کے ثوابت کے خلاف مہم کھڑی کی جا رہی ہے، جس کا عندیہ عبدالفتاح السیسی نے عسکری انقلاب کے وقت ہی دے دیا تھا لہٰذا ہم اللہ کے ہاں بری الذمہ ہونے کی غرض سے دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں لا کھڑا کرنے کی امریکی دھمکی سے قطع نظر کمربستہ ہو کر اس کی بھرپور مخالفت کریں گے اور اس سلسلے میں دیے جانے والے ہر مشورے کا خیر مقدم کریں گے۔

س: سیسی، مرسی، مصری عوام اور ترکی کے نام آپ کا کوئی پیغام؟ یہ جانتے ہوئے کہ یہ دونوں ممالک خطے میں مرکزی اہمیت کے حامل ہیں؟

ج: سیسی کو ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ یہ نہ بھولو اللہ سبحانہ و تعالیٰ تم سے، تمہارے مددگاروں سے قوی تر ہے اور تمہارا نصیب ہر انسان کی طرح قبر اور روزِ قیامت حساب و احتساب ہے لہٰذا اللہ کے عذاب سے نجات پانے کی راہ تلاش کرو۔

جہاں تک مصر کے دستوری حکمراں ڈاکٹر محمد مرسی حفظہ اللہ کا معاملہ ہے تو ہم انہیں کہتے ہیں کہ اللہ آپ کی آزمائش میں آپ کا حامی و ناصر ہو۔ ہم اور کُل عالم گواہ ہے کہ آپ اپنی قوم کے امین تھے اور آپ نے ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور تمام تر مصائب و دباؤ کے آگے آپ کا ڈٹ جانا ہر مصری نوجوان اور تمام دنیا کے احرار کے لیے باعث فخر ہے اور مصری عوام کو ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ اب جبکہ حق باطل سے عیاں ہو چکا اور فراعنہ کے باطل منکشف ہو چکے تو جسد واحد کی مانند اس اساس پر لوٹ آؤ جس پر ۲۵ جنوری ۲۰۱۱ء کو تھے۔

اور ہم اپنے اخوانی ساتھیوں سے یہ کہنا چاہیں گے کہ اللہ آپ کے معاملات میں آپ کا کارساز ہو اور آپ کی تکالیف اور صبر پر آپ کو جزائے خیر دے۔ اللہ کے وعدے پر یقین کامل رکھیں جو پورا ہو کے رہتا ہے اور فتح باذن اللہ عنقریب آپ کی قدم بوسی کرے گی اور ترکی، ترک عوام اور ان کے محترم صدر کو ہم کہنا چاہیں گے کہ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو، آپ کی سمت درست رکھے اور آپ کی حفاظت فرمائے اور آپ کو اس تمام دباؤ کے مقابل ثابت قدم رہنے پر بے پناہ جزائے خیر عطا فرمائے، جس کا سامنا آپ کو اس ملک کی حقیقی قیادت کی حمایت کے سلسلے میں اور اللہ کے بعد ان کو پناہ دینے کے باعث کرنا پڑا۔

اور مملکت سعودی عرب سے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ دین اسلام کی امانت، حرمین کا تقدس اور بطریق احسن دعوۃ الی اللہ کا بار آپ کی گردنوں پر ہے۔

قطر کے خلاف پابندیوں کے محرکات

علی یونس

دو سال پہلے سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بحرین اور مصر نے قطر سے سفارتی تعلقات ختم کرنے کا اعلان کیا تھا اور ساتھ ہی قطر کا زمینی، سمندری اور فضائی بائیکاٹ بھی کر دیا تھا۔ مستقبل قریب میں خلیجی ممالک کے اس بحران کے ختم ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔

خلیجی تجزیہ نگاروں کے مطابق یہ تعلقات اب کبھی بحال نہیں ہوسکیں گے۔ قطر میں ہونے والے ''تیرہویں الجزیرہ فورم'' سے بات چیت کرتے ہوئے تجزیہ کاروں نے کہا کہ قطر اور دوسرے خلیجی ممالک کو ابھی بھی سعودی عرب اور امارات کی طرف سے سخت ردعمل کا خطرہ لاحق ہے، جس کے نتیجے میں پابندیاں جاری رہیں گی۔

جارج ٹاؤن یونیورسٹی دوحہ کے پروفیسر نے بتایا کہ تعلقات کی بحالی کی شرائط اب بھی وہی ہیں، جو ۲۰۱۷ء سے پہلے تھیں۔ پروفیسر ملر نے الجزیرہ سے بات کرتے ہوئے کہا کہ خلیج کے دوسرے چھوٹے ملکوں کی نسبت قطر نے اپنی آزادانہ خارجہ اور داخلہ پالیسی بنا کر سعودی اثر ورسوخ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ ہائیڈروکاربن کے ذخائر کی مدد سے قطر نے ملک کی معاشی صورتحال کو مستحکم رکھا ہے، جدید طرز کی سڑکیں اور ٹریفک کا نظام بنایا اور شہریوں کا طرز زندگی بلند کیا ہے، پوری دنیا میں قطر کے شہریوں کا طرزِ زندگی سب سے بلند ہے کوئی بھی دوسری خلیجی ریاست ابھی تک یہ بلند ترین ہدف نہیں حاصل کر سکی ہے۔

خارجہ پالیسی کے تحت قطر کی آزادانہ علاقائی پالیسی نے عرب دنیا کے اس وقت کے مقبول مطالبے "جمہوریت" کی حمایت کی ہے، خصوصاً اس وقت بھی یہ حمایت جاری تھی جب عرب بہار کے تحت شمالی افریقا اور عرب ریاستوں میں بغاوتیں عروج پر تھیں۔

مشرق وسطیٰ کے تنازعات

ملر نے قطر اور اس کے ہمسایوں کے تعلقات بگڑنے کی دو وجوہات بیان کیں، پہلی یہ کہ خطے میں سیاسی اور سیکورٹی تبدیلیاں جو کہ عرب بہار کا باعث بنیں، دوسری سعودیہ اور ابوظہبی میں اقتدار میں نئی نسل کا آنا جو کہ جارحانہ اور پرعزم تو ہے لیکن اپنے بزرگوں کی طرح محتاط نہیں ہے۔ سعودیہ اور ابوظہبی کے حکمراں قطر کی مخالف پالیسیوں کو دیکھتے ہوئے خطے کی پالیسی مرتب کر رہے ہیں۔

سیاسی علوم کے پروفیسر ماجد انصاری کے مطابق سعودیہ اور امارات عرب حکومتوں کے اتحاد کی قیادت کر رہے ہیں، جس کے ذریعے وہ عرب بہار کے اثرات زائل کر کے ایک بار پھر بادشاہی نظامِ حکومت خطے میں قائم کریں گے۔ ماجد انصاری نے مزید کہا کہ خلیجی ممالک کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہ سعودیہ سے بہت محتاط رہتے ہیں کیونکہ سعودی ریاست پورے خلیجی خطے پر غلبہ پانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

سعودی وامارات محور

قطر کے مخالفین قطر پر ایران کے ساتھ مل کر خطے میں دہشت گردی کا الزام لگاتے ہیں، جب کہ قطر اس الزام کی تردید کرتا رہا ہے۔ ماجد انصاری نے الجزیرہ سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کے سعودی وامارات اتحاد ٹرمپ کی موجودگی میں اپنے ایجنڈے کو خطے میں نافذ کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ موجودہ حالات میں انھیں ٹرمپ کی حمایت بھی حاصل رہے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ مشرق وسطیٰ میں کوئی بھی ریاست اگر جمہوری نظام چاہتی ہے تو وہ سعودی عرب اور امارات کے نشانے پر ہوگی۔ ماجد انصاری کے مطابق قطر خطے میں اصلاحات کے لیے اپنی ''سوفٹ پاور''، بین الاقوامی ذرائع ابلاغ اور سفارت کاری کو استعمال کر رہا ہے اور یہی بات سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کو گوارا نہیں ہے۔

ملر نے الجزیرہ سے گفتگو میں بتایا کہ قطر اور خلیج کی چھوٹی ریاستیں بحران کے دہانے پر ہیں اور سیاسی طور پر غیر مستحکم ہیں حالانکہ پابندیاں لگنے کے بعد قطر نے اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر اپنی طاقت کا ثبوت دیا ہے۔ جبکہ عرب ممالک قطر پر پابندیاں لگانے کے بعد ہفتے کے اندر اندر قطر میں شدید بحران کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

خلیج تعاون کونسل کا مستقبل

خلیجی ممالک کے اتحادی اور بین الاقوامی برادری دونوں ہی بہت غور سے خلیج میں اٹھنے والے تنازعات کو دیکھ رہے ہیں۔ خلیج کے تجزیہ کاروں کے مطابق خلیج تعاون کونسل اب مکمل طور پر سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے ہاتھوں میں کھیلے گی جب کہ قطر اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے خطے کے دوسرے ممالک اور بین الاقوامی برادری میں اپنے دوست تلاش کرے گا جن کی سیاسی اور سیکورٹی مفادات یکساں ہوں۔

ملر کے مطابق سعودی عرب اور امارات کو جب بھی محسوس ہوا کہ خلیج تعاون کونسل ان کے مفادات کی حفاظت نہیں کر پا رہی تو وہ اس فورم کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے، لیکن فی الحال ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ دوسری طرف قطر کے لیے یہ آسان ہے کہ وہ خطے کے دیگر ممالک اور دنیا بھر میں مختلف ممالک سے اپنے تعلقات کو مضبوط کرے۔ (مترجم: سمیہ اختر)

"Behind the punishing blockade against Qatar". ("aljazeera.com". May 2, 2019)

سیرتؐ کے موضوع پر اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

اوراقِ سیرت ﷺ

مولانا سید جلال الدین عمری

قیمت: ۴۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5

فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کا شائع کردہ جدید ایڈیشن

حدیثِ نبویؐ اور سائنسی علوم

مولانا عبدالحق ہاشمی

قیمت: ۵۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5

فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون 021-36809201

بچوں کے ذہنی ونفسیاتی امراض ومسائل کا مختصر جائزہ

بچوں کے ذہنی امراض

فوزیہ عباس

قیمت: ۳۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5

فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون 021-36809201

بھارت میں مسلم تشخص بدلنے کی کوششیں

اویس حفیظ

بھارت میں مسلم تہذیب وتمدن کے آثار اگرچہ شدت پسند ہندو تنظیموں کو روزِ اول سے کھٹکتے ہیں لیکن اب بھارت کی سیاست کا مرکزی نکتہ ہی برصغیر پر مسلم تہذیب کے اثرات سے چھٹکارا اور مسلمانوں کی نشانیاں مٹانا بن گیا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال گزشتہ دنوں اس وقت دیکھی گئی جب بھارت کے تاریخی حیثیت کے شہر الٰہ آباد کا نام اتر پردیش کی ریاستی حکومت کی جانب سے تبدیل کر کے ''پریاگ راج'' اور فیض آباد کا نام بدل کر ''ایودھیہ'' رکھا گیا۔ الٰہ آباد جیسے تاریخی شہر کا نام تبدیل کرنے کی مضحکہ خیز وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ شہر کا ''اصلی اور پرانا'' نام پریاگ راج ہی تھا۔ حکومتی جماعت کی جانب سے دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ صرف تاریخ میں درج ''غلطیوں'' کو درست کر رہی ہے۔ حالانکہ تاریخ دان اس بات کو سرے سے نہیں مانتے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر این آر فاروقی کے مطابق تاریخی دستاویزات اور کتابوں کے مطابق پریاگ راج نام کا کبھی کوئی شہر بسا ہی نہیں، البتہ ''پریاگ'' نام سے منسوب ہندوؤں کا ایک زیارتی مقام ضرور ہوا کرتا تھا، جس کا ذکر اب صرف کتابوں میں موجود ہے۔

مغل سلطنت کے بانی جلال الدین محمد اکبر کا آباد کردہ ۴۴۳ سالہ قدیم شہر الٰہ آباد نہ صرف بھارت بلکہ پاکستان کے لیے بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ مفکرِ پاکستان ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے ۱۹۳۰ء میں اپنا خطبہ اسی شہر میں منعقدہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں دیا تھا۔ اردو کے مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ اسی لیے جب اکبر نے اقبال کو ''لنگڑے آم'' کا تحفہ بھیجا تو اس پر بے ساختہ اقبال نے کہا:

اثر یہ تیرے انفاسِ مسیحائی کا ہے اکبر
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا، لاہور تک پہنچا

بھارت کے لیے یہ شہر اس حوالے سے اہم ہے کہ بھارت کا سب سے بڑا میلا ''کمبھ کا میلہ'' جو ہر بارہ سال بعد منعقد ہوتا ہے' اسی شہر میں ہوتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ہندومت کے دو مقدس دریاؤں گنگا اور جمنا کا سنگم ہوتا ہے۔

بھارت کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا تاریخی گھر ''آنند بھون'' بھی اسی شہر میں ہے اور یہ شہر بالی وڈ اسٹار امیتابھ بچن کی جائے پیدائش بھی ہے۔

الٰہ آباد اور فیض آباد کے ناموں کی تبدیلی کے ساتھ ہی ریاست میں آگرہ، لکھنؤ اور علی گڑھ کے نام بھی بدل کر ہندو ناموں پر رکھنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا ہے۔ اس سے قبل بھارتیا جنتا پارٹی کے رکن اسمبلی برجیش سنگھ نے چند ماہ قبل دیوبند شہر کا نام بدل کر ''دیوورند'' رکھنے کی تجویز بھی پیش کی تھی اور ریاستی حکومت اس مطالبے پر بھی ''سنجیدگی'' سے غور کر رہی ہے۔ شہروں کا نام تبدیل کرنے سے انتہا پسند تنظیموں کو کھلی چھوٹ مل گئی ہے اور مسلم تہذیب کی علامات کو چن چن کر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اتر پردیش کی دیکھا دیکھی بھارتی ریاست گجرات کی حکومت نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ وہ ''احمد آباد'' کا نام بدل کر ''کرناوتی'' کرنے جا رہی ہے۔ ریاست کے وزیر اعلیٰ وجے روپانی کا کہنا ہے کہ ریاست کے لوگ ایک عرصے سے احمد آباد کا نام تبدیل کر کے کرناوتی رکھنے کا مطالبہ کر رہے ہیں، اب حکومت ان کے مطالبہ پر ''غور'' کر رہی ہے۔ مزید یہ کہ اگر نام بدلنے کے عمل میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں آئی تو آئندہ پارلیمانی انتخابات سے پہلے احمد آباد کا نام تبدیل کر دیا جائے گا۔ اس کے لیے مطلوبہ منظوری حاصل کرنے کے لیے قانونی عمل شروع کر دیا گیا ہے۔ نائب وزیر اعلیٰ نے وزیر اعلیٰ کے بیان کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ احمد آباد نام ہندوؤں کی غلامی کی علامت ہے جبکہ کرناوتی ہندوؤں کے افتخار، وقار، ثقافت اور خودمختاری کا غماز ہے۔

اسی طرح گجرات کی پڑوسی ریاست مہاراشٹر میں بھی کم از کم دو شہروں کے نام بدلنے کا مطالبہ سامنے آیا ہے۔ حکمران جماعت شیوسینا کے رکن پارلیمان ''سنجے راوت'' نے اپنے ایک ٹویٹ میں کہا ہے کہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ نے الٰہ آباد کا نام پریاگ راج اور فیض آباد کا نام ایودھیا کر دیا ہے، مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ اورنگ آباد کا نام سمبھاجی نگر اور عثمان آباد کا نام دھاراشیو نگر کب رکھیں گے؟

راوت نے مزید کہا کہ ان دونوں شہروں کے نام بدلنے کا مطالبہ بہت پرانا ہے لیکن ماضی کی حکومتوں نے مسلمانوں کی ناراضی کے خدشے سے ان کا نام تبدیل نہیں کیا۔ اسی طرح بھارت کی جنوبی ریاست تلنگانہ میں بھی ایک ہندو نواز رہنما نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کی حکومت اسمبلی انتخابات میں اقتدار میں آ گئی تو وہ حیدرآباد اور جڑواں شہر سکندر آباد کے اسلامی ناموں کو بدل دیں گے۔ ان ناموں کو بدلنے کے پیچھے بھی یہی دلیل دی جا رہی ہے کہ ان کے موجودہ نام ہندوؤں کی غلامی کی علامت ہیں۔ بقول ان کے یہ سبھی شہر دورِ قدیم میں ہندوؤں اور ہندو مذہبی کرداروں کے نام پر تھے جنہیں مسلم حکمرانوں بالخصوص مغلوں نے تبدیل کر دیا۔ ابھی تک کوئی ایک بھی ایسی ٹھوس دلیل پیش نہیں کی جا سکی، جس کی بنا پر یہ دعویٰ ثابت کیا جا سکے مگر ہندو تنظیموں کے اعلیٰ عہدیداروں سے کارکنان تک سبھی اس بات کو دہراتے ہیں کہ مسلمان بادشاہوں بالخصوص مغل حکمرانوں نے ہندومت کے تاریخی شہروں کا نام قصداً تبدیل کیا۔

دنیا بھر کے مبصرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شہروں، علاقوں کے نام بدلنے کے پیچھے اصل مقصد ماضی کی نام نہاد عظمت اور تہذیبی وراثت کو بحال کرنا نہیں بلکہ دورِ حاضر کے مسلمانوں کو یہ باور کروانا ہے کہ جمہوری بھارت کی تہذیب و تمدن کا مطلب ''ہندو تہذیب وتمدن'' ہے اور اس تہذیب میں مسلمانوں اور ماضی کے مسلم حکمرانوں کا کوئی کردار نہیں، خود بھارت کے اندر بھی منصف مزاج شخصیات کی جانب سے ایسے خدشات کا بارہا اظہار کیا جا چکا ہے۔

شہروں کے نام تبدیل کرنے کے مطالبات کے علاوہ تاج محل، پرانا قلعہ اور دہلی کی جامع مسجد جیسی تاریخی عمارتوں کے گرد نئے تنازعات کھڑے کیے جا رہے ہیں اور تاریخی عمارتوں کے بارے میں یہ تاثر پھیلایا جا رہا ہے کہ یہ عمارتیں ہندو مندروں کو توڑ کر بنائی گئی تھیں۔ بھارتی دارالحکومت دہلی کے ہمایوں پور میں واقع تغلق دور کے ایک مقبرے کو مندر میں تبدیل کیا جا چکا ہے جبکہ دہلی کے مرکز میں انڈیا گیٹ کے نزدیک واقع اکبر روڈ کا تنازع بڑھتا جا رہا ہے۔ اب تو اکبر روڈ کے سائن بورڈ پر کہیں کالک لگا دی جاتی ہے تو کہیں راتوں رات ''مہارانا پرتاپ روڈ'' کا بورڈ نصب کر دیا جاتا ہے حالانکہ سرکاری طور پر ابھی تک سڑک کا نام تبدیل کرنے کا باضابطہ اعلان نہیں کیا گیا۔ کافی عرصے سے اکبر روڈ کا نام شدت پسند ہندو تنظیموں کو کھٹک رہا ہے اور کئی بار سڑک کے بورڈ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کے الزام میں کئی ہندو انتہا پسند تنظیموں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو گرفتار بھی کیا گیا مگر کچھ عرصہ قبل بھارت کے وزیر اعظم نے بھی دہلی کے اکبر

روڈ کا نام تبدیل کر کے رانا پرتاپ کے نام پر رکھنے کا اشارہ دیا تھا، جس سے شدت پسند تنظیموں کو شہ ملی مگر اس بیان پر خود بھارت کے چند نمایاں طبقات کی جانب سے غیر متوقع ردِعمل سامنے آیا۔ بھارت کے مشہور دانشور پروفیسر رام پُنیانی نے اپنے مختلف لیکچروں میں سڑک کا نام تبدیل کرنے کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔

پروفیسر پُنیانی کے بقول ''سڑک کا نام تبدیل کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بادشاہ اکبر غیر ملکی اور مسلمان تھا اور اس کا ہندوستانی تاریخ سے بطور ہندوستانی کوئی تعلق نہیں تھا۔ جبکہ مہارانا پرتاپ ہمارے اپنے ہندو راجہ تھے۔ اس لیے اکبر روڈ کا نام تبدیل کر کے مہارانا پرتاپ روڈ رکھا جائے۔

آیے! دیکھتے ہیں کہ کیا مہارانا پرتاپ اور بادشاہ اکبر کی لڑائی اپنی حکومت اور ریاست کے لیے تھی یا یہ ہندومت اور اسلام کی جنگ تھی۔ بادشاہ اکبر اور رانا پرتاپ کی لڑائی ہلدی گھاٹی کے مقام پر لڑی گئی۔ ایک طرف بادشاہ اکبر کی فوج کھڑی تھی اور دوسری طرف رانا پرتاپ کی۔ حیران کن صورت حال یہ تھی کہ اکبر کی فوج میں بادشاہ خود موجود نہیں تھا اور فوج کی کمان راجہ مان سنگھ کے پاس تھی۔ یعنی بادشاہ کی غیر موجودگی میں اس کی جگہ 'راجہ مان سنگھ' فوج کی کمان سنبھالے ہوئے تھا اور اس کے زیرِ کمان شہزادہ سلیم تھا۔ راجہ مان سنگھ، بادشاہ اکبر کے پردھان سینا پتی (آرمی چیف) تھے۔ دوسری طرف رانا پرتاپ کی فوج کی کمان کس کے پاس تھی؟ حکیم خان سور کے پاس۔ یعنی ایک طرف ہندو اور دوسری طرف مسلمان۔ تو کیا یہ ہندو مسلمان کی لڑائی ہے یا دو راجاؤں کی لڑائی ہے؟''

بھارت میں مذہبی جنون کے زیرِ اثر نہ صرف شہروں کے نام تبدیل کیے جا رہے ہیں بلکہ تاریخ کے نصاب اور متن میں بھی تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ ماضی کے حکمرانوں کی جنگوں کی تشریح ''ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی جنگ'' کے طور پر کی جا رہی ہے اور ہندو حکمرانوں کو فقط راجا نہیں بلکہ ہندو مذہب کے ہیرو اور چیمپیئن جبکہ مسلم حکمرانوں کو غاصب اور لٹیروں کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے متعلق بارہا یہ بات کی جاتی ہے کہ اس نے خزانہ لوٹنے کے لیے سورت پر حملہ کیا۔ لیکن سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہی خزانہ دہلی میں تھا یا سورت میں؟ پھر یہ حقیقت بھی سب کے سامنے ہے کہ مغل حکمرانوں نے برصغیر کا خزانہ کہیں اور منتقل نہیں کیا بلکہ تمام تر پیسہ برصغیر پر ہی خرچ ہوا۔ کوئی ایک مغل بادشاہ بھی ایسا نہیں تھا جس نے برصغیر کا پیسہ لوٹ کر کسی دوسرے ملک (افغانستان) منتقل کیا ہو بلکہ مغل حکمرانوں نے تو برصغیر میں جابجا عوام کے لیے مسافر خانے بنوائے اور ایسی شاہکار عمارات بنوائیں، جن کا حسن آج بھی بھارت کے ماتھے کا جھومر ہے۔ خود بھارتی حکومت کے مطابق بھارت آنے والے ایک چوتھائی سے زائد سیاح صرف تاج محل دیکھنے بھارت آتے ہیں اور سالانہ کروڑوں مقامی و غیر ملکی سیاح تاج محل کے حسن سے مسحور ہونے کے لیے آگرہ کا رخ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بغضِ مسلم کا عالم یہ ہے کہ حکمران جماعت بھارتیا جنتا پارٹی (بی جے پی) کے رہنما سوم سنگیت نے تو مطالبہ کیا ہے کہ مغل بادشاہوں 'بابر، اکبر، شاہجہاں اور اورنگزیب کا نام بھارت کی تاریخ سے مٹا دیا جائے'۔ اس سارے پس منظر میں بھارت کے مسلم رہنما اسد الدین اویسی کا یہ مطالبہ لائقِ توجہ ہے کہ مسٹر مودی لال قلعے کی فصیل پہ بھارتی جھنڈا لہرانا بند کر دیں کیونکہ لال قلعہ بھی ''غداروں'' کا بنایا ہوا ہے اور اگر حکومت میں دم ہے تو یونیسکو سے کہے کہ تاج محل کو عالمی ثقافتی ورثے کی فہرست سے نکال دے۔

بھارت میں تاریخ کے ساتھ جو کھلواڑ ہو رہا ہے، اس پر خود تاریخ دان بھی حیران ہیں۔ چار، پانچ صدیوں کے بعد بھارتی عوام کو یہ باور کروایا جا رہا ہے کہ مغل بادشاہ ''جلال الدین محمد اکبر'' ایک کٹر مذہبی بادشاہ تھا جس کی تمام تر تگ و دو اپنے مذہب کے لیے تھی، حالانکہ یہ وہ سفید جھوٹ ہے، جو چھپائے نہیں چھپ سکتا کیونکہ اکبرِ اعظم کے بارے میں سب کو علم ہے کہ وہ مذہب سے اس حد تک متنفر تھا کہ اس نے اپنے ایک الگ مذہب ''دینِ اکبری'' کی بنیاد رکھی۔ جس میں سب سے زیادہ سہولیات ہندوؤں کو ہی دی گئی تھیں۔ (حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے مکتوبات سے یہ بات واضح ہے کہ دورِ اکبری میں کفار برملا شعائرِ اسلام کی توہین کرتے تھے، مسلمانوں کے جان و مال غیر محفوظ تھے، مسجدیں شہید کی جاتی تھیں، اسلامی احکام کی انجام دہی ممنوع قرار دی گئی اور مسلمانوں کو دینی امور کی انجام دہی سے باز رکھا جاتا) پھر اکبر کے نورتنوں (مشیروں) میں سے اکثریت ہندومت ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے باوجود اکبر سے اس بغض کی سب سے بڑی وجہ ہلدی گھاٹ کی وہ لڑائی ہے، جس میں اکبر نے رانا پرتاپ کو شکست سے دوچار کیا۔ مگر انتہا پسند ہندو آج بھی اس بات کو دل سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ رانا پرتاپ کو، جسے بھارت میں مہارانا پرتاپ کہا جاتا ہے، کو انتہا پسندوں کے نزدیک ایک اوتار کا درجہ حاصل ہے اور اوتار کسی سے شکست نہیں کھا سکتا۔ سخت گیر ہندو نظریات کی وجہ سے شہرت پانے والے ریاست اتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ یوگی ادتیہ ناتھ تو یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ ''اکبر کو نہیں بلکہ رانا پرتاپ کو عظیم کہا جائے''۔ اسی طرح بھارتی وزیرِ داخلہ راج ناتھ سنگھ نے ریاست راجستھان کے اس فیصلے کا سرِعام خیر مقدم کیا جس میں ریاست نے (تاریخ کو بدلتے ہوئے) بچوں کو نصاب میں یہ پڑھانے کا فیصلہ کیا کہ ہلدی گھاٹی کی جنگ میں اکبر کی فوج کو شکست اور مہارانا پرتاپ کو فتح ہوئی تھی۔ حیران کن امر یہ ہے کہ اس بات کا خیال مہارانا پرتاپ کی ۴۷۵ویں برسی کے موقع پر ہی کیوں آیا؟ کیا پونے پانچ سو سال تک عوام کو غلط تاریخ پڑھائی جاتی رہی جبکہ یہ سوال بھی اپنی جگہ برقرار رہے گا کہ اگر بالفرض اکبر کو ہلدی گھاٹی کے مقام پر مہارانا پرتاپ کی فوج سے شکست ہوئی تھی تو تختِ دلّی پر کون قابض ہوا تھا؟ کیونکہ تاریخ تو ہمیں یہی بتاتی ہے کہ ۱۵۷۶ء میں ہلدی گھاٹی میں ہونے والی جنگ کے بعد راجپوت راجہ رانا پرتاپ پہاڑوں کی طرف چلے گئے اور بعد میں اکبر نے فوج کی خود کمان سنبھالی اور اس خطے کے بیشتر علاقوں پر قبضہ حاصل کر لیا۔

دوسری طرف مہاراشٹر کے اسکولوں میں بھی مغل حکمرانوں کی تاریخ کو نصاب سے مکمل طور پر ہٹا دیا گیا ہے اور ان کے بجائے نصاب مکمل طور پر ''شیوا جی'' پر مرکوز کر دیا گیا ہے۔ اس ''تاریخ'' کے مطابق ۱۷ویں صدی میں شیوا جی نے مغلوں کو شکست دے کر مراٹھا سلطنت کی بنیاد رکھی اور مہاراشٹر سمیت ہندوستان کے کئی حصوں پر حکومت کی۔ مہاراشٹر کی ''ہسٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی'' کی اس حوالے سے توضیح یہ ہے کہ ''مغل تاریخ کا احاطہ کرنے کے لیے ہم کتابوں سے مراٹھا تاریخ کو نہیں ہٹا سکتے۔ ہمارے بچے مہاراشٹر کے ہیں لہٰذا مراٹھا تاریخ سے ان کا تعلق پہلے بنتا ہے اور یہ قدم صفحات کی تعداد محدود ہونے کے باعث اٹھایا گیا''۔

کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ''ہندوستان'' کا نام بھی نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ''باہر سے آنے والے'' مسلمانوں نے رکھا۔ وہی اس کو ''ہند، ہند'' پکارتے تھے۔ اسی مناسبت سے یہاں آباد لوگوں کو 'ہندو' کا نام دیا گیا اور یہاں کی بولی کو ہندی یا ہندوی کہہ کر پکارا گیا۔ پھر یہ حقیقت بھی کسی سے ڈھکی

باقی صفحہ نمبر ۱۵

نواں باب

ترکِ وطن: چند ثقافتیں شاید افضل ہیں

Yuval Noah Harari

اگرچہ عالمگیریت نے پوری دنیا میں ثقافتی اختلافات بہت حد تک گھٹا دیے ہیں، مگر ساتھ ہی اجنبی لوگوں سے ملاقاتیں آسان ہوگئی ہیں، اور عجیب حالات سے واسطے بھی پڑنے لگے ہیں۔ اینگلو سیکسن انگلینڈ اور انڈین پالا ایمپائر میں بہت فرق تھا جبکہ آج کے بھارت اور برطانیہ میں یہ فرق بہت کم رہ گیا ہے۔ جیسے جیسے زیادہ سے زیادہ لوگ روزگار، بہتر مستقبل، اور تعلیم کی تلاش میں سرحدیں پار کرتے ہیں، مقامی سیاست میں تارکین وطن کے حوالے سے تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ شناختوں میں تصادم کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس صورتحال سے سب سے زیادہ یورپ متاثر ہے۔ یورپی یونین اس عزم پر مستحکم ہوئی تھی کہ یونانیوں، ہسپانویوں، جرمنوں اور فرانسیسیوں کے درمیان فاصلے کم کرے گی۔ افریقی باشندوں، ایشیائی باشندوں، اور یورپی اقوام کے مابین یہ ثقافتی خلیج شاید ختم نہ کی جاسکے، اور یہ نااہلی یورپی یونین کو شاید لے ڈوبے۔ یہ تلخ حقیقت ہے کہ یورپ ابتدا میں بین الثقافتی ماحول قائم کرنے میں کامیاب رہا، جس کی وجہ سے تارکین وطن کی یورپ میں بھرمار ہوئی۔ شامی تارکین وطن سعودی عرب، ایران، یا روس کی نسبت جرمنی نقل مکانی کرنا چاہتے ہیں کیونکہ جرمنی بھرپور خیر مقدم کرتا ہے، اور بودو باش کی بہترین سہولیات مہیا کرتا ہے، اس حوالے سے اس کا ریکارڈ بہت اچھا ہے۔

تارکین وطن اور پناہ گزینوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے یورپی باشندوں میں ملا جلا ردعمل پیدا کیا ہے۔ یورپ کی شناخت اور مستقبل پر تلخ مباحث چھڑ گئے ہیں۔ کچھ یورپی مطالبہ کرتے ہیں کہ براعظم کا دروازہ بند کردیا جائے: کیا یہ لوگ یورپ کی بین الثقافتی پہچان سے پیچھے ہٹ رہے ہیں، اور برداشت کی اعلیٰ روایات سے منہ موڑ رہے ہیں؟ یا بڑی تباہی سے بچنے کی معقول توجیح پیش کررہے ہیں؟ جبکہ دیگر کہتے ہیں کہ براعظم کے دروازے پوری طرح سے کھلے رکھنے چاہییں: کیا یہ لوگ یورپی اقدار سے وفادار ہیں؟ یا یہ یورپ کی غلط توقعات کو بڑھا چڑھا رہے ہیں؟ یہ بحث کبھی کبھی لڑائی میں ڈھل جاتی ہے۔ اس معاملہ کی صراحت کے لیے ضروری ہے کہ ترک وطن کا مسئلہ تین مراحل کی روشنی میں سمجھا جائے۔

اول: میزبان ملک تارکین وطن کو داخلے کی اجازت دے۔

دوئم: اس کے بدلے تارکین وطن لازماً مقامی معاشرے کی اقدار قبول کریں، خواہ اس کا مطلب اپنی روایات اور اقدار ترک کرنا ہو۔

سوم: اگر تارکین وطن مقامی اقدار کو کافی حد تک اپنا لیتے ہیں اور میزبان ملک کے شہریوں جیسے بن جاتے ہیں، یعنی 'وہ' سے 'ہم' بن جاتے ہیں۔

یہ تین مراحل تین واضح مباحث کو جنم دیتے ہیں۔ چوتھی بحث ان مراحل پر مکمل عملدرآمد کی ہے۔ جب لوگ امیگریشن کے معاملے پر ان مباحث میں پڑتے ہیں۔ وہ اکثر الجھ جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کا الگ الگ جائزہ لیا جائے۔

بحث اول: میزبان ریاست تارکین وطن کا خیر مقدم کرے۔ مگر وہ ایسا ڈیوٹی سمجھ کر کرے یا مہربان بن کر؟ کیا یہ میزبان ریاست کا فرض ہے کہ ہر کسی کے لیے اپنے دروازے کھول دے یا درست انتخاب سے کام لے، یا پھر تارکین وطن کا راستہ بالکل بند کردے؟ جو تارکین وطن کی میزبانی کے حق میں ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ پناہ گزینوں اور غربت کے مارے تارکین وطن کو قبول کرنا ریاست کی اخلاقی ذمے داری ہے۔ خاص طور پر ایک عالم گیر دنیا میں یہ ضروری ہے۔ سب انسانوں کی دیگر انسانوں کی طرف اخلاقی ذمے داریاں بنتی ہیں، اور جو ان اخلاقیات پر عمل نہیں کرتے وہ انا پرست اور نسل پرست ہیں۔ مزید یہ کہ تارکین وطن کا بہاؤ مکمل طور پر روکنا ممکن نہیں ہے۔ خواہ ہم کتنی ہی دیواریں اٹھادیں اور باڑیں لگادیں۔ مایوس اور پریشان حال لوگ کسی نہ کسی طرح رستہ نکال لیتے ہیں۔ اس لیے یہ بہتر ہے کہ امیگریشن کو قانونی جواز مہیا کیا جائے، اور زیر زمین انسانی اسمگلنگ جیسی لعنت سے بچا جائے۔

امیگریشن کے مخالفین کا کہنا ہے کہ اگر آپ مناسب طاقت کا استعمال کریں تو تارکین وطن کو مکمل طور پر روکا جاسکتا ہے۔ بدحال پناہ گزینوں کے سوا کسی کے لیے سرحدیں کھولنا اخلاقی ذمے داری نہیں۔ ترکی کی شاید یہ اخلاقی ذمے داری بنتی ہے کہ شامی باشندوں کو پناہ دے، مگر سوئیڈن کی یہ ذمے داری نہیں کہ وہ ترکی سے نقل مکانی کرنے والے شامی باشندوں کو قبول کرے (پروفیسر نوح ہراری شام کے جنگی تھیٹر پر نگاہ غلط انداز ڈالے بغیر تعصب زدہ تبصرہ فرمارہے ہیں۔ شام میں یورپ، امریکا، اور روس نے حسب توفیق تباہی مچائی ہے، ظالم آمر بشار الاسد کو مکمل تحفظ فراہم کیا ہے۔ امریکا اور روس نے شام کی انسانی آبادیوں پر بھرپور بمباری کی، شہر حلب باقاعدہ تباہ کیا گیا۔ شام کی بربادی میں یورپ سمیت پورا مغرب مرکزی مجرم ہے۔ لہٰذا شامی پناہ گزینوں کی بدحالی کی ذمے داری مغرب پر براہ راست عائد ہوتی ہے۔ جبکہ ترکی وہ واحد ملک ہے، جس کا شام کی بربادی میں کوئی ہاتھ نہیں، اس کے باوجود شامی باشندوں کی سب سے کثیر تعداد ترکی میں پناہ گزین ہے، اور وہاں انہیں عزت دی گئی ہے)۔ امیگریشن مخالفین کہتے ہیں کہ ہر فرد کا حق ہے کہ بیرونی حملے سے اپنا بچاؤ کرے چاہے وہ تارکین وطن کی صورت میں ہو۔ سوئیڈن کے لوگوں نے لبرل جمہوریت کے قیام کے لیے بڑی محنت کی ہے، بہت قربانیاں دی ہیں۔ اگر شام کے لوگ لبرل جمہوریت نہیں اپنا سکے تو اس میں سوئیڈن کا کیا قصور ہے؟ (پروفیسر صاحب مسلمان پناہ گزینوں کے بارے میں یورپی تعصب نمایاں کررہے ہیں۔ اول تو لبرل جمہوریت کوئی معیار نہیں۔ دوئم لبرل یورپ میں مسلمان خواتین کے پردے پر جس طرح حملہ کیا گیا ہے، وہ آمریت اور بادشاہت کے بس کی بات نہیں۔ یورپ اور امریکا نے جمہوریت کی ترویج کے نام پر مسلم دنیا میں جس طرح آمریتوں کی سرپرستی کی ہے، اُس کی بدترین مثال مصر ہے جہاں فرعون صفت جنرل السیسی یورپ کی آشیرباد سے جمہور کی رائے کچل چکا ہے۔)

بہت سے ممالک ہیں، جو غیر قانونی تارکین وطن کی جانب سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں، یا انہیں عارضی طور پر قبول کرلیتے ہیں کیونکہ انہیں سستے مزدور اور صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم، بعد میں یہ ریاستیں ان سستے مزدوروں کو قانونی حیثیت دینے سے انکار کردیتی ہیں۔ یہ وہ معاشرے ہوتے ہیں جہاں مقامی باشندوں کا اعلیٰ طبقہ غیر ملکی مزدور طبقے کا استحصال کرتا ہے۔ جیسا کے قطر اور دیگر خلیجی ممالک میں ہوتا ہے۔ جب تک یہ تنازع حل نہیں ہوتا۔ دیگر ذیلی سوالات کبھی سلجھائے نہیں جاسکتے۔ اس بحث کے دو پہلو ہیں۔ ایک تارکین وطن کے حق میں ہے، دوسرا ان کے خلاف ہے۔ اگر تارکین وطن میزبان ملک میں انتشار اور عدم برداشت کا

سبب ہیں، تو بہت جلد لبرل یورپی باشندے اپنی رائے ترک کردیں گے اور امیگریشن کے خلاف ہوجائیں گے۔ اس کے برعکس، اگر تارکین وطن خود کو لبرل ثابت کردیں گے، اور مذہب کی طرف سے خود کو کھلے دل و دماغ کا ظاہر کریں گے، تو امیگریشن کے خلاف دلائل کمزور پڑ سکتے ہیں (یعنی مسلمان تارکین وطن اسلام ترک کردیں تو مغرب میں قابل قبول ہیں۔ یہ ہیں لبرل اقدار کے علمبردار، جنہیں آرتھوڈکس یہودی عورت کا سخت ترین پردہ قبول ہے، عیسائی دلہن کا نقاب اور راہباؤں کا اسکارف قبول ہے مگر مسلمان عورت کا پردہ قبول نہیں)۔ تاہم، اس کے باوجود یورپ کے لیے بے مثال قومی شناختوں کا سوال اپنی جگہ رہے گا۔ برداشت عالمی قدر ہے۔ جب تک یورپی ممالک اپنی اپنی قدروں میں تقسیم رہیں گے، امیگریشن کے معاملہ پر کسی واضح پالیسی پر نہیں پہنچ سکتے (یورپ کو اسلامی اقدار کے خلاف متحد ہونے کی دعوت دی جارہی ہے)۔ اگر یہ سوال حل ہو جائے تو پچاس کروڑ یورپی باشندوں کے لیے دس لاکھ پناہ گزینوں کو جذب کرنا یا انہیں نکالنا کوئی مسئلہ نہ بنے گا۔

اس بحث کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر وقت کا تعین کیا جائے، کہ آیا کتنے عرصہ میں تارکین وطن مقامی معاشرے میں جذب ہو سکتے ہیں؟ اگر اجتماعی گروہوں کی سطح پر دیکھا جائے تو چالیس سال کا عرصہ بہت کم ہے۔ مقامی معاشرے سے یہ توقع رکھنا مشکل ہے کہ وہ چند دہائیوں میں تارکین وطن کے بڑے گروہوں کو جذب کرسکے۔ ماضی میں بڑی تہذیبوں نے غیر ملکیوں کو آسانی سے جذب کرلیا تھا۔ رومی تہذیب، مسلم خلافت، چینی سلطنت اور امریکی ریاست سب کو غیر ملکیوں کو قبول کرنے میں صدیوں کا عرصہ لگا (یہ غلط بیانی ہے، مسلم اندلس اور بغداد میں عیسائی، یہودی، اور دیگر تہذیبوں کے باشندے روز اول سے جذب کرلیے گئے تھے)۔ تاہم ایک نوجوان کے لیے چالیس سال کا عرصہ زندگی پر محیط ہے۔ ایک الجزائری لڑکی جو فرانس میں پیدا ہوئی ہو، جس نے کبھی الجزائر نہ دیکھا ہو اور جو عربی کی نسبت فرانسیسی زیادہ بولتی ہو، اُس سے یہ کہنا کہ وہ واپس الجزائر چلی جائے، کیا یہ مناسب لگتا ہے؟

ان سارے مباحث کی تہہ میں ایک بڑا بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ کیا کچھ ثقافتیں دوسری ثقافتوں سے افضل ہیں؟ یا ساری ثقافتیں یکساں ہیں؟ کیا جرمن یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ شامی باشندے کم تر ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے انہیں جذب کرنے میں احتیاط ضروری ہے؟

نسل پرستی سے بین الثقافتی ہم آہنگی تک

ایک صدی پیچھے یورپی باشندوں کا یہ خیال تھا کہ وہ کوئی اعلیٰ نسل ہیں، جو باقی نسلوں سے افضل ہیں۔ ۱۹۴۵ کے بعد ایسے خیالات نفرت انگیز قرار دیے گئے۔ نسل پرستی نہ صرف اخلاقی طور پر قبیح سمجھی گئی، بلکہ سائنسی طور پر بے بنیاد قرار پائی۔ ماہرین جینیات نے اس بات کے ٹھوس شواہد مہیا کردیے ہیں کہ یورپی باشندوں اور دیگر نسلوں کے باشندوں میں حیاتیاتی تفریق ناقابل توجہ ہے، بہت ہی خفیف سا فرق ہے۔ تاہم، ماہرین بشریات، ماہرین سماجیات، مؤرخین، ماہرین معاشیات نے بھرپور ڈیٹا جمع کیا ہے، جو انسانی ثقافتوں کے درمیان نمایاں اختلافات واضح کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ثقافتوں کا اختلاف نہ ہوتا تو مؤرخین اور ماہرین بشریات کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کیوں معمولی سے فرق کے مطالعہ پر سرمایہ کاری کی گئی؟ اگر یہ ثقافتی اختلافات اتنے ہی غیر اہم ہوتے تو ہارورڈ کے انڈر گریجویٹ کے حوالے سے جو کچھ دریافت کیا گیا ہے، وہ کالاہاری کے شکاریوں پر صادق آنا چاہیے تھا۔ اکثر لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی ثقافتوں میں اختلافات موجود ہیں۔ ان اختلافات کو کس طرح دیکھنا چاہیے؟ کلچرل ریلیٹوسٹ دلیل دیتے ہیں کہ لوگ مختلف انداز میں سوچ سکتے ہیں مگر ہمیں اس گونا گونی کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ سب کی اقدار، عقائد اور اعمال کو یکساں اہمیت دینی چاہیے۔ بدقسمتی سے یہ ذہنی وسعت حقیقت میں نایاب ہے۔ تمام ثقافتیں یکساں طور پر قبول نہیں کی جاتیں۔ اکیسویں صدی کے اوائل میں جرمن ثقافت سعودی ثقافت کی نسبت غیر ملکیوں کے لیے زیادہ قابل قبول ہے۔ ایک مسلمان کے لیے جرمنی منتقل ہونا آسان ہے، مگر ایک عیسائی کے لیے سعودی عرب منتقل ہونا دشوار ہے۔ یہاں تک کہ ایک شامی پناہ گزین کے لیے جرمنی منتقل ہونا زیادہ آسان ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جرمن ثقافت سعودی ثقافت سے بہتر ہے (پروفیسر ہراری صاحب نے دیگر مغربی مؤرخین کی طرح 'ثقافت' کو 'تہذیب' کے ساتھ خلط مبحث کردیا ہے۔ جبکہ تہذیب کے موضوع پر بھی باقاعدہ مضمون اس کتاب میں شامل کیا ہے، وہاں بھی یہ 'سقم' موجود ہے۔ سعودی حکومت کا طرز عمل اسلام کا ترجمان نہیں ہے۔ یہ واضح رہنا چاہیے کوئی بھی مسلمان حکومت اسلامی تہذیب کی نمائندہ نہیں۔ اس لیے اسلامی تہذیب کے خلاف حجت بھی نہیں۔ اس کے لیے پروفیسر صاحب کو مسلمان حکومتوں کے بجائے اسلام کا مطالعہ کرنا چاہیے)۔ اس قسم کا ثقافتی فرق درحقیقت نسل پرستی نہیں بلکہ 'کلچرسٹ' کا اپنی ثقافت کی حمایت کرنا ہے۔ روایتی نسل پرستی یوں بھی علم حیاتیات کی نئی تحقیق میں زمین بوس ہوچکی ہے۔ جو لوگ نسل پرستانہ باتیں کرتے ہیں اُن کی پشت پر کوئی سائنسی توجیح موجود نہیں۔ ان کی کوئی سیاسی وقعت نہیں۔ لہٰذا اصل مسئلہ ڈی این اے میں نہیں بلکہ ثقافتی وابستگی میں موجود ہے۔ لوگ نسلی تعصب حیاتیاتی فرق کے سبب ظاہر نہیں کرتے بلکہ تاریخی رویے کے طور پر اپناتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ آج کے کلچرسٹ روایتی نسل پرستوں سے شاید بہتر ثابت ہوں۔ اگر تارکین وطن ہماری ثقافت قبول کرتے ہیں تو ہم انہیں برابری کی بنیاد پر قبول کرلیں گے۔ بصورت دیگر اُن (تارکین وطن) پر اس قبولیت کے لیے شدید دباؤ ہوگا۔ آپ کسی کالے کو اس لیے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ وہ اپنا رنگ گورا کرلے۔ مگر افریقیوں اور مسلمانوں کو اس بات کا ذمے دار ٹھہرا سکتے ہیں کہ وہ مغربی ثقافت کی اقدار کیوں قبول نہیں کرتے؟

کلچرازم اختلافات کی سائنسی بنیادیں نسلی تفاوت کے مقابلے میں زیادہ مستحکم ہیں۔ علوم بشریات اور سماجیات کے ماہرین ثقافتی اختلافات کی اہمیت نہیں جھٹلا سکتے۔ تاہم، ہم کلچرسٹ کے سارے دلائل قبول نہیں کرسکتے۔ اکثر کلچرسٹ کہتے ہیں کہ تین مسائل انہیں درپیش ہیں۔ پہلا الجھاؤ مقامی بالادستی اور معروضی بالادستی میں امتیاز کا ہے۔ برداشت اور عدم برداشت کا تعین کرنا دشوار ہے۔ ثقافت سے ہماری کیا مراد ہے؟ کیا اسلامی ثقافت ساتویں صدی کے جزیرہ نما عرب کی ثقافت ہے؟ یا سولہویں صدی کی سلطنت عثمانیہ کی ثقافت ہے؟ یا اکیسویں صدی کے پاکستان کی ثقافت ہے؟ ثقافت جانچنے کا کیا طریقہ حتمی ہے (پروفیسر ہراری یہاں تسلیم کرتے ہیں کہ اُن پر تہذیب اور ثقافت کا فرق واضح نہیں)؟ اگر ہم مذہبی اقلیتوں کے بارے میں برداشت کی بات کریں تو سولہویں صدی کی سلطنت عثمانیہ کی ثقافت اپنے دور کے مغربی یورپ کی ثقافت سے بہت زیادہ اعلیٰ وارفع تھی۔ اگر ہم آج کے طالبان والے افغانستان کا موازنہ آج کے ڈنمارک سے کریں، تو ہم بالکل مختلف نتیجے پر پہنچیں گے۔ لہٰذا ترک وطن پالیسی کے مخالفین کو فاشسٹ کہنا آسان نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح امیگریشن کے حامیوں کے لیے 'ثقافتی خودکشی' کی اصطلاح استعمال کرنا بھی دشوار ہے۔

اس وقت یہ واضح نہیں کہ یورپ درمیان کی کون سی راہ اختیار کرسکتا ہے۔ جس میں تارکین وطن کو جذب کرنا اور

مقامی اقدار کا تحفظ بہ یک وقت ممکن ہو سکے۔ اگر یورپ ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکا، تو پوری دنیا میں یہ طریقہ رائج کیا جا سکے گا۔ اگر یورپی فارمولا ناکام ہوتا ہے، تو واضح ہو جائے گا کہ لبرل اقدار بین الثقافتی تنازعات حل نہیں کر سکتیں، اور نہ ہی انسانیت کو متحد کر سکتی ہیں۔ ایسا ہونا بدقسمتی ہوگا، کیونکہ دہشت گردی کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ دہشت گردی انسانیت کے کمزور حصے کا بڑا ہتھیار ہے (غیر منطقی بات ہے۔ کمزور طبقہ مظلوم ہو سکتا ہے دہشت گرد نہیں۔ دہشت گردی صرف طاقتور قوتوں کا ہتھیار ہے۔ پہلی بار 'دہشت گردی' کی اصطلاح انقلاب فرانس میں استعمال ہوئی، جن کے لیے استعمال ہوئی وہ ہرگز کمزور طبقہ نہیں تھا)۔

جنگ: انسانی حماقت کو کبھی حقیر نہ جانو

آخری چند دہائیاں انسانی تاریخ کا پرامن ترین دور ہے۔ ابتدائی زرعی معاشروں کی مجموعی آبادی کا پندرہ فیصد جنگ و تشدد میں مارا جاتا تھا۔ مگر بیسویں صدی میں یہ شرح پانچ فیصد پر پہنچی اور آج ایک فیصد پر آ گئی ہے۔ (گمراہ کن مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ بیسویں صدی انسانی تاریخ سب سے زیادہ ہلاکت خیز دور کہلاتا ہے، پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کی خونریزی کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہاں پروفیسر صاحب الفاظ کا گورکھ دھندہ کر رہے ہیں۔ زرعی دور کی وضاحت کے بغیر پندرہ فیصد اموات کی شرح پیش کر دیتے ہیں، یعنی زرعی دور کی کُل آبادی پچاس لاکھ تھی، اُس کا پندرہ فیصد ساڑھے سات لاکھ نفوس بنتے ہیں۔ جبکہ بیسویں صدی کی چھ ارب آبادی کا پندرہ فیصد ۹۰ کروڑ بنتا ہے۔ یقیناً بیسویں صدی میں ۹۰ کروڑ انسان جنگوں میں نہیں مارے گئے، پھر کتنے مارے گئے؟ تیس کروڑ انسان بیسویں صدی کی جنگوں میں مارے گئے، یہ اعداد و شمار بھی اصل سے بہت کم ہے۔ آخری دہائیوں کا جائزہ لیا جائے تو ۹۰ کی دہائی میں بوسنیا اور الجزائر کا قتل عام، کشمیر و فلسطین کا قتل عام، اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں دس پندرہ لاکھ عراقی مسلمانوں کا قتل عام، افغانستان میں لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام، دیگر بے حساب قتل عام وہ ہیں، جنہیں قابل اعتنا سمجھا ہی نہ گیا۔ پروفیسر صاحب غالباً مغرب میں ہلاکتوں کی شرح پیش کر رہے ہیں، جو ظاہر ہے نہ ہونے کے برابر ہے۔ چنانچہ پرامن ترین دور کا دعویٰ نہ صرف صریحاً جھوٹ ہے، بلکہ سچائی کے برعکس ہے۔)

۲۰۰۸ء کے عالمی مالیاتی بحران سے صورتحال تیزی سے بگڑی، جنگی جنون کا ماحول لوٹ آیا اور فوجی مہم جوئی بہت بڑھ گئی۔ لوگ ڈرتے ہیں کہ شام کے صحرا میں کوئی چھوٹا سا حادثہ یا جزیرہ نما کوریا میں کوئی احمقانہ حرکت عالمی جنگ چھیڑ سکتی ہے۔ ۱۹۱۴ء سے ۲۰۱۸ء کے دوران جنگ کے معاملات میں چند بنیادی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ خاص طور پر ۱۹۱۴ء کی جنگ میں عالمی اشرافیہ کے لیے سرمایہ کاری کا بڑا سامان تھا۔ کیونکہ کامیاب جنگیں معاشی مواقع فراہم کر رہی تھیں۔ جبکہ ۲۰۱۸ء میں جنگیں خطرناک انواع بن چکی ہیں۔

برطانیہ نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر قبضہ کیا اور تل الکبیر کے معرکہ میں صرف ۵۷ فوجی گنوائے، جب کہ آج کسی مسلم ملک پر قبضہ کرنا مغرب کے لیے کسی بھیانک خواب سے کم نہیں۔ دیگر یورپی ملکوں نے برطانیہ کی تقلید کی اور ویتنام، لیبیا اور کانگو میں قدم جمائے۔ اُن کا واحد خدشہ یہ تھا کہ کوئی دوسرا غاصب پہلے نہ پہنچ جائے۔ (پروفیسر صاحب نوآبادیاتی لوٹ مار کو کامیاب مغربی پالیسی قرار دے رہے ہیں۔ اُن کے نزدیک آج کے مسلمان ممالک میں حملہ کرنے کے لیے بڑی مزاحمت کا سامنا ہوتا ہے، شہری آبادیوں کے بڑے بڑے قتل عام کرنے پڑتے ہیں۔ یہ صورتحال فوری طشت از بام ہو جاتی ہے جبکہ نوآبادیاتی دور میں دہائیوں تک غصب کا دھندہ بلا روک ٹوک چلتا رہا تھا۔) یہاں تک کہ امریکا نے بھی اپنی طاقت کا اظہار معاشی کے بجائے عسکری میدان میں کیا۔ ۱۸۴۶ء میں امریکا نے میکسیکو، کیلیفورنیا، نیواڈا، ایریزونا، نیومیکسیکو، کولوراڈو، کنساس، ویامنگ اور اوکلاہوما پر حملہ کیا۔ ٹیکساس سے الحاق کا معاہدہ طے پایا۔ اس جنگ میں ۱۳/ ہزار امریکی فوجی کام آئے۔ ۲۳ لاکھ اسکوائر کلومیٹر علاقہ امریکا میں شامل ہوا۔ (یہاں اس تاریخی حقیقت کا ذکر برمحل ہوگا کہ یورپی غاصبوں نے امریکا کے اصل باشندوں 'ریڈ اینڈینز' کے کئی بڑے بڑے قتل عام کیے۔ 'تہذیب' کے فروغ کے لیے ہر قتل عام میں ڈیڑھ دو کروڑ ریڈ انڈینز مارے گئے، اُن کی املاک لوٹی گئیں۔ Battle of ،The Gnaddenhutten Massacre ،Tippecanoe ،The Creek War اور Mankato Executions خونریزی کے بڑے واقعات ہیں۔) ۱۹۱۴ء میں واشنگٹن، لندن اور برلن کے اشرافیہ بخوبی جانتے تھے کہ کامیاب جنگی مہم کیا ہوتی ہے اور کتنا مال و زر اس میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ ۲۰۱۸ء میں یہ اشرافیہ اس طرز کی جنگ میں مالی فوائد نہیں دیکھ رہی ہے۔ اگرچہ آج بھی تیسری دنیا کے آمر اور غیر ریاستی عناصر جنگی رجحان میں نشوونما پا رہے ہیں۔ (عالمی تعلقات عامہ کا عام سا طالب علم بھی جانتا ہے کہ مغرب کی اشرافیہ مسلم دنیا میں آمریت اور بادشاہت کی پشتیبان ہے۔ استعماریت کی صرف ہیئت بدلی ہے، اور اس میں بھی جہاں قتل عام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہاں شام ملبے تلے چلا جاتا ہے، عراق برباد ہو جاتا ہے اور میانمار میں مسلمان بھیڑ بکریوں کی طرح مارے کاٹے جاتے ہیں۔) افغانستان اور عراق میں کھربوں ڈالر کا زیاں سامنے کی حقیقت ہے۔ یہاں تک کہ مشرق وسطیٰ میں، جو دنیا کی جنگی پٹی ہے، علاقائی طاقتیں نہیں جانتیں کہ کامیاب جنگ کس طرح چھیڑی جائے۔ عراق ایران جنگ میں طویل خونریزی سے ایران کو کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ جس کے بعد ایران نے براہ راست جنگوں سے گریز کیا۔ ایران نے مالی اور عسکری طور پر عراق سے یمن تک مقامی تحریکوں کے ذریعے حصہ لیا۔ شام اور لبنان میں پاسداران انقلاب کو بھیجا گیا تاکہ اتحادیوں کی مدد کریں، مگر وہ براہ راست حملے سے گریزاں ہی رہے۔ اس کے باوجود ایران علاقائی طاقت بن گیا ہے۔ ایران کے دو دشمن عراق اور امریکا جنگ کی دلدل میں پھنسے اور ایران نے فائدے سمیٹے۔ ایسا ہی اسرائیل کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ جنگی حالات کے باوجود اسرائیل ترقی کرتا رہا ہے۔ شام کی جنگ میں ملوث نہ ہونا اسرائیل کی اہم کامیابی ہے۔ اگر اسرائیل چاہتا تو ہفتہ بھر میں دمشق پر قبضہ کر لیتا، مگر اس طرح اسرائیل کیا حاصل کرتا؟ اسرائیلی فوج کے لیے یہ آسان تھا کہ غزہ پر قبضہ کر لیا جاتا اور حماس کا اقتدار ختم کر دیا جاتا، مگر اسرائیل نے ایسا کرنے سے گریز کیا۔ تمام عسکری مہارت کے باوجود اسرائیل جانتا ہے کہ جنگ سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ (یہاں 'فتح' اور 'قبضہ' کا فرق واضح ہو رہا ہے۔ گو کہ پروفیسر صاحب خود اس فرق سے واقف نظر نہیں آتے۔) امریکا، چین، جرمنی، جاپان اور ایران کی طرح اسرائیل بھی سمجھتا ہے کہ اکیسویں صدی میں کامیاب ترین پالیسی یہ ہے کہ 'پراکسی وار' لڑی جائے۔ (کرائے کے دہشت گرد مشرق وسطیٰ میں اسرائیل اور دیگر غاصب قوتوں کے لیے پراکسی وار لڑ رہے ہیں۔ داعش اور کرد علیحدگی پسند نمایاں ہیں۔)

جنگ جیتنے کا فن کھویا گیا

اکیسویں صدی میں بڑی طاقتوں کے لیے جنگ چھیڑنا دشوار کیوں ہے؟ پہلی وجہ معیشت کی نوعیت میں تبدیلی ہے۔ ماضی میں مالی اثاثے مادی تھے۔ اس لیے جنگ جیتنے کا مطلب خود کو مالا مال کرنا تھا۔ (مغرب کا تصور 'جنگ' صرف لوٹ مار اور غصب پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان سمیت

کہیں 'فتح' کا کوئی امکان پیدا نہ ہوسکا۔) اگر آپ اپنے دشمن کو میدان جنگ میں شکست دیتے تھے، تو اُن کے شہروں کو لوٹ لیتے تھے، اُن کے شہریوں کو غلام بنا کر بیچ دیتے تھے، سونے کی کانوں اور گندم کے گوداموں پر قبضے کر لیتے تھے۔ رومیوں نے یونانی اور گال غلاموں کی تجارت سے مادی ترقی کی اور انیسویں صدی میں امریکیوں نے کیلیفورنیا میں سونے کی کانوں پر قبضے کیے ٹیکساس میں مویشیوں کے باڑے چھینے۔ آج کے معاشی اثاثے ٹیکنیکل اور اداراتی نوعیت کے ہیں۔ آپ جنگ لڑ کر 'معلومات' پر قبضہ نہیں جما سکتے۔ تاہم داعش جیسی تنظیم آج بھی لوٹ مار سے پھل پھول سکتی ہے۔ انہوں نے ۲۰۱۵ء میں عراقی بینکوں سے پچاس کروڑ ڈالر لوٹے۔ امریکا اور چین جیسے ملکوں کے لیے یہ رقم بہت معمولی ہے۔ چین بیس کھرب ڈالر سالانہ جی ڈی پی کے ساتھ ایسی کسی جنگ میں ملوث نہیں ہوسکتا، جہاں محض کروڑوں یا اربوں ڈالر کا فائدہ نظر آرہا ہو۔ امریکا کے خلاف کسی جنگ میں کھربوں ڈالر کی سرمایہ کاری چین کے مفاد میں نہیں۔ کیا پیپلز لبریشن آرمی سیلیکون ویلے میں لوٹ مار کرسکتی ہے؟ بلاشبہ ایپل، فیس بک اور گوگل جیسی کارپوریشنز کے اثاثے اربوں ڈالرز کے ہیں، مگر اسے بزور طاقت چھینا نہیں جاسکتا۔ سیلیکون ویلے میں کہیں سیلیکون کی کانیں نہیں ہیں۔

آج کی کامیاب جنگ وہ ہے، جو جیتنے والے کو منافع بخش عالمی تجارت کا اہل بنادے۔ جیسے برطانیہ نے نپولین کی شکست اور امریکا نے ہٹلر کی ناکامی پر کیا تھا۔ تاہم، ملٹری ٹیکنالوجی میں تبدیلیاں آچکی ہیں، اب وہ پہلے جیسے مالی فوائد ممکن نہیں۔ ایٹم بم نے عالمی جنگ میں فتح کا مطلب اجتماعی خودکشی بنادیا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ ہیروشیما پر ایٹمی حملے کے بعد بڑی طاقتیں کبھی براہ راست متحارب نہیں ہوئیں۔ یہاں تک کہ جارج ڈبلیو بُش کے دور میں بھی یہ ممکن تھا کہ بغداد اور فلوجا کو بارود کا ڈھیر بنادیا جائے، جبکہ عراقی فرانسسکو اور شکاگو پر بمباری کرکے بدلہ لینے کے قابل نہ تھے۔ لیکن اگر آج امریکا کسی ایسے ملک پر حملہ کرے جس میں سائبر وارفیئر کی عام سی صلاحیتیں بھی ہوئیں، تو جنگ چند منٹوں میں کیلیفورنیا اور الینوائے تک گھسیٹی جاسکے گی۔ Malwares اور لوجک بم ڈیلاس کا فضائی ٹریفک روک سکتے ہیں۔ فلاڈلفیا میں ٹرینوں کا حادثہ کرواسکتے ہیں۔ مشی گن کا الیکٹرک گرڈ ڈھا سکتے ہیں۔

نیوکلیئر ہتھیار اور سائبر وارفیئر انتہائی زیادہ نقصان پہنچانے والی کم منافع بخش ٹیکنالوجیز ہیں۔ آپ ان کے ذریعے ریاستیں تباہ کرسکتے ہیں مگر تعمیر نہیں کرسکتے۔ ہمارے لیے امن کی بڑی ضمانت یہ ہے کہ بڑی طاقتیں جدید جنگوں کے 'فلسفہ کامیابی' سے مانوس نہیں۔ آج کے قوم پرست رہنما اردوان، مودی، یا نیتن یاہو اونچی آواز میں بیانات تو دے سکتے ہیں مگر جنگ نہیں چھیڑ سکتے، اس معاملہ میں حد درجہ احتیاط سے کام لیا جارہا ہے۔ اگر اکیسویں صدی کے حالات میں کوئی کامیاب جنگ کا فارمولا پالیتا ہے، تو وہ سوائے تباہی و بربادی کے کچھ نہ ہوگا۔

حماقت مارچ

افسوس! اب جب کہ جنگ کوئی منافع بخش کاروبار بھی نہیں رہا ہے، امن کی ضمانت دینا ممکن نہیں۔ ہمیں انسانی حماقت کو کبھی بھی بعید از امکان نہیں سمجھنا چاہیے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر، انسان خود کو تباہ کرنے پر تلے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے معاملہ میں اچھنبے کی بات یہ سامنے آئی ہے کہ شکست خوردہ قومیں بے مثال ترقی کرگئیں۔ اُن کی افواج کی مکمل بربادی اور ریاستوں کی تباہی کے بیس سال بعد جرمن، اطالوی اور جاپانی بے مثال دولت کے مالک بن چکے تھے۔ کیوں؟ اس وجہ سے کہ وہ جنگ میں کودے تھے؟ یا لاکھوں کروڑوں انسانوں کو موت کے منہ میں دھکیلنے کی وجہ سے ایسا ہوا تھا؟ یہ سب بالکل احمقانہ اندازے ہیں!

تیس کی دہائی میں جاپانی جرنیل، ایڈمرل، اور ماہرین معاشیات اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کوریا، منچوریا اور چینی ساحل پر قبضے کے بغیر جاپانی معیشت جمود کا شکار ہوجائے گی۔ وہ سب غلط تھے۔ کیونکہ جاپان کی اصل ترقی ہی اُس وقت شروع ہوئی جب سارے اہم علاقے اُس کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ انسانی حماقت تاریخ کے اہم محرکات میں سے ایک ہے۔ سیاستدان، جنرلز اور اسکالرز دنیا کو شطرنج کی عظیم بساط سمجھتے رہے ہیں، جہاں ہر قدم محتاط اندازوں سے اٹھایا جاتا ہے۔ یہ بات اصولی طور پر ٹھیک ہے۔ بہت ہی کم عالمی رہنماؤں نے ایسا پاگل پن دکھایا ہے کہ بلا سوچے سمجھے مہرے حرکت میں لائے ہوں۔ جنرل ٹوجو، صدام حسین اور کم یونگ ایل نے بہت محتاط اقدام لیے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی بساط شطرنج سے زیادہ پیچیدہ ہے اور انسانی سمجھ اب تک اسے نہیں پاسکی ہے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے معقول رہنما احمقانہ حرکتیں کرتے رہے ہیں۔

ہمیں عالمی جنگ کے خطرے سے کتنا ڈرنا چاہیے؟ یقیناً دو انتہاؤں سے بچنا لازم ہوگا۔ ایک جانب یہ سمجھنا ہوگا کہ جنگ ناگزیر نہیں ہے۔ سرد جنگ کا پُرامن خاتمہ ثابت کرتا ہے کہ جب انسان درست فیصلے لیتے ہیں، تو عالمی طاقتوں کے درمیان بھی معاملات پُرامن طور پر طے پاجاتے ہیں۔ دوسری صورت میں یہ سمجھنا بھی نادانی ہوگا کہ آج جنگ ناممکن ہے۔ گو کہ جنگ تباہ کُن ہے مگر انسانی حماقت سے جرم کبھی بھی سرزد ہوسکتا ہے۔ انسانی حماقت کا ایک مؤثر علاج 'عاجزی' ہے۔ قومی، مذہبی اور ثقافتی تناؤ اُس وقت تباہ کُن بن جاتے ہیں، جب وہ 'میری قوم، میرا مذہب، اور 'میری ثقافت سب سے افضل' بن جاتا ہے۔ ہم کس طرح قوموں، مذاہب اور ثقافتوں کو اُن کے اصل مقام کے حوالے سے حقیقت پسند بناسکتے ہیں؟ اس پر غور کرنا ہوگا۔

(کتاب: "اکیسویں صدی کے اکیس سبق"۔ ترجمہ و تلخیص: ناصر فاروق)

بقیہ: بھارت: خوف کا نیا دور

ہندوؤں سے واضح طور پر الگ رہنے پر مجبور ہیں۔ نازیہ ارم کا کہنا ہے کہ الیکٹرانک چینل اور سوشل میڈیا نے معاملات کو انتہائی بگاڑ دیا ہے۔ سوشل میڈیا پر ہر وقت کوئی نہ کوئی اِشو زندہ رکھا جاتا ہے۔ پوری کوشش کی جاتی ہے کہ ہم آہنگی کی فضا کسی بھی طور پیدا ہی نہ ہو۔ اختلافی اُمور کو ہوا دی جاتی ہے۔ ملک کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ یہاں تو ہمیشہ کشیدگی ہی برقرار رہتی ہے۔ نازیہ کہتی ہیں کہ بھارت میں بہت کچھ خطرناک حد تک بدل چکا ہے۔ کل تک لوگ ساتھ رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھاتے بھی تھے۔ اب ایسا نہیں ہے۔ اب صرف شکوک ہیں، نفرت ہے اور کشیدگی ہے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"India's Muslims quiver in the new dawn of an emboldened Narendra Modi".
("theguardian.com". May 26, 2019)

بقیہ: بھارت میں مسلم تشخص بدلنے کی کوششیں

چھپی نہیں کہ جب تک ''اردو'' لفظ عام نہیں ہوا تھا تب تک اس زبان کو ہندی یا ہندوی ہی کہا جاتا تھا حتیٰ کہ اردو کے سب سے بڑے شاعر مرزا غالب تک اس زبان کو ہندی یا ہندوی کہتے تھے۔ موجودہ رسم الخط میں لکھی گئی اردو کو پہلے ''ہندی رسم الخط'' ہی کہا جاتا تھا۔ آج بھی میوزیم یا پرانے کتب خانوں میں مروجہ اردو رسم الخط میں لکھی گئی ایسی کتابیں مل جاتی ہیں جن کی پیشانی پر ''ہندی رسم الخط'' کے الفاظ واضح ہوتے ہیں۔ اس لیے بھارت کے حکمران اور انتہا پسند ہندو بھلے اس بات سے لاکھ انکار کریں مگر حقیقت یہی ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں اور مسلم و مغل حکمرانوں کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ (بحوالہ "hilal.gov.pk")

ماحولیاتی تبدیلیاں اور دَم توڑتی زمینیں

Michael Snyder

قدرتی وسائل کے بے محابا استعمال کے باعث ہماری زمین کا پورا ماحول شدید خطرے میں ہے۔ نئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے سیّارے کا مجموعی زندگی پرور نظام ناکارہ ہوتے چلے جانے سے حیوانات کی کم و بیش ۱۲۰۰/انواع کے معدوم ہوجانے کا خطرہ لاحق ہوچلا ہے۔

آج دنیا بھر میں ماحول ناکامی کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے اور کسی کو بھی کچھ اندازہ نہیں کہ اس عمل کو کیسے روکا جائے۔ حال ہی میں کی جانے والی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا بھر میں پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں سمیت کم و بیش پانچ ہزار حیوانات کی انواع کو معدوم ہوجانے کا خطرہ لاحق ہے۔ ان میں سے ایک چوتھائی یا تقریباً ۱۲۰۰/انواع مکمل طور پر ناپید ہوجائیں گی۔ ہر دور میں دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں مختلف انواع کو خطرات لاحق رہے ہیں مگر پورے کرۂ ارض پر اتنی بڑی تعداد میں انواع کے معدوم ہوجانے کا خطرہ پہلے کبھی لاحق نہیں رہا۔ انتہائی افسوسناک امر یہ ہے کہ دنیا بھر میں واضح اکثریت کو ماحول میں پیدا ہونے والی گراوٹ کی کچھ پروا نہیں۔ ماحول کی گراوٹ کے بارے میں سوچنے والے خال خال ہیں۔ یہ خیال، غیر معمولی کوششوں کے باوجود، اب تک عام نہیں کیا جاسکا کہ زمین اور اس کے ماحول کو پہنچنے والا نقصان ہم سب کا ذاتی نقصان ہے کیونکہ ماحول میں رونما ہونے والی گراوٹ کے شدید منفی اثرات سے ہم کسی طور بچ نہیں پاتے۔

برطانوی اخبار دی گارجین کا کہنا ہے کہ کم و بیش ۱۲۰۰/انواع ایسی ہیں جن کے ۹۰ فیصد سے زائد ٹھکانے تباہی سے دوچار ہیں۔ یہ انواع مکمل طور پر معدوم ہونے سے زیادہ دور نہیں۔ آسٹریلیا کی یونیورسٹی آف کوئینز لینڈ اور دی وائلڈ لائف کنزرویشن سوسائٹی سے وابستہ سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے بتایا ہے کہ ۵۴۵۷ جانداروں کی نسل خطرے میں ہے۔ یہ انواع اگر گئیں تو ہمیشہ کے لیے گئیں۔

یہ تحقیق بڑے پرندوں، ممالیہ اور ایمفیبینز پر کی گئی ہے۔ کیڑے مکوڑوں کی دنیا کا اور بھی برا حال ہے۔ ماہرین بتاتے ہیں کہ ماحول میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے باعث ہر سال کیڑے مکوڑوں کی تعداد میں ڈھائی فیصد تک کمی آرہی ہے۔ زمین جانداروں کے معدوم ہوجانے کے مرحلے سے پانچ بار گزر چکی ہے۔ اب چھٹے دور کی تیاری ہے۔ سائنسی تحقیق پر مبنی ۷۳/رپورٹس کے سروے سے معلوم ہوا ہے کہ اگر روئے ارض سے کیڑوں مکوڑوں کے رخصت ہونے کا سفر یونہی جاری رہا تو ۲۱۱۹ء تک روئے ارض پر حشرات الارض میں سے کوئی نہیں بچے گا۔ دنیا بھر میں خوراک کے ماخذ کے لیے کیڑے مکوڑے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ذرا سوچیے کیڑوں مکوڑوں کے چلے جانے سے روئے ارض پر کس نوعیت کے اثرات مرتب ہوں گے۔

خوراک کے ماخذ پر کیڑوں مکوڑوں کے چلے جانے کے انتہائی خطرناک اثرات مرتب ہوں گے۔ شہد کی مکھیاں بھی ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ دنیا سے شہد کی مکھیاں ختم ہوجائیں تو انسانوں کو شدید نوعیت کے منفی اثرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ انتہائی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تیزی سے خطرناک ہوتی ہوئی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے جس نوعیت کی فکرمندی لوگوں میں ہونی چاہیے وہ کسی بھی سطح پر دکھائی نہیں دے رہی۔

سمندروں میں ایک چھوٹا آرگنزم phytoplankton (نبات تیرا کہ) پایا جاتا ہے۔ فائٹو پلانکٹن کاربن ڈائی آکسائڈ کو ایک مخصوص عمل سے گزار کر آکسیجن پیدا کرتے ہیں۔ سمندروں میں پایا جانے والا یہ آرگنزم آکسیجن پیدا کرنے میں وہی کردار ادا کرتا ہے جو روئے ارض پر پودے اور درخت ادا کرتے ہیں۔ کینیڈا کی ڈلہاؤزی یونیورسٹی کے محققین نے جدید ترین طریقوں سے کی جانے والی تحقیق کے نتیجے میں بتایا ہے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد سے اب تک فائٹو پلانکٹن میں ۴۰ فیصد سے زائد کمی واقع ہوچکی ہے۔ فائٹو پلانکٹن کے بغیر ہمارے سمندر ''ڈیڈ زون'' بن جائیں گے۔ آبی حیات کو زندہ رہنے اور تیزی سے پروان چڑھنے کے لیے آکسیجن کی جو مقدار درکار ہوتی ہے وہ اگر نہ ملے تو آبی حیات کا تنوع بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا جائے گا۔ فائٹو پلانکٹن کی تعداد میں رونما ہوتی ہوئی کمی خوراک کے بحری ماخذ پر بھی شدید منفی اثرات مرتب کررہی ہے۔

فائٹو پلانکٹن میں کمی کا مطلب ہے، تھایامائن میں کمی۔ تھایامائن میں کمی کا مطلب ہے سمندر میں خوراک کے ذرائع میں پیدا ہونے والے معیار اور مقدار کی گراوٹ۔ سمندری پرندوں کی تعداد میں بھی ۷۰ فیصد کمی واقع ہوسکتی ہے۔

بہت سے سمندری خطوں میں پہلے ہی خرابیاں بڑھ چکی ہیں۔ شمالی مائن کے سمندری خطے میں سیگلز کی تعداد کسی زمانے میں غیر معمولی ہوا کرتی تھی۔ اب وہاں سیگلز ڈھونڈنے سے دکھائی نہیں دیتے۔ اگر یہی حال رہا تو سمندر مچھلیوں سے خالی ہوتے جائیں گے اور صرف جیلی فش رہ جائے گی۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ ہمارا سیارہ رفتہ رفتہ دم توڑتا جارہا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ اس حوالے سے کچھ بھی کرنے کے لیے ہمارے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے بہت تیزی سے کرنا ہے۔ اور غلطی کی بھی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس دوران مغربی تہذیب بھی تیزی سے موت کو گلے لگا رہی ہے۔ پال جوزف واٹسن نے ''دی کولیپس آف ویسٹرن سویلائزیشن'' کے عنوان سے ایک شاندار دستاویزی فلم تیار کی ہے۔ ایک مضمون میں واٹسن نے لکھا ہے کہ ایک طرف تو روحانی اقدار کی پامالی ہے اور دوسری طرف کیمیائی اشیا پر غیر معمولی انحصار۔ رہی سہی کسر جذبات کو برانگیختہ کرنے والی اشیا کے غیر معمولی استعمال نے پوری کردی ہے۔ کسی بھی عظیم تہذیب کو برباد کرنے والے جتنے بھی بنیادی عوامل ہوا کرتے ہیں وہ سب مغربی تہذیب میں نمایاں ہوتے جارہے ہیں۔ ہمارا جانا ٹھہر گیا ہے۔ معاشی خرابیوں نے خرابیوں کو مزید ہوا دی ہے۔ منشیات پر انحصار خطرناک اور شرم ناک حد تک بڑھ گیا ہے۔

مذہب سے بیزاری مغربی معاشرے میں عام ہے۔ اپنے آپ کو باضابطہ مسیحیوں کی حیثیت سے شناخت کرانے والوں کی تعداد میں تیزی سے کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔ معاشرہ وسعت سے محروم ہوچکا ہے، ہمیں خود بھی نہیں معلوم کہ ہم کس طرف جارہے ہیں۔ شراب اور نشہ آور ادویہ کے استعمال سے اور خودکشی کی صورت میں واقع ہونے والی اموات کا تناسب خطرناک رفتار سے بڑھتا جارہا ہے۔ دی ٹرسٹ فار امریکاز ہیلتھ اینڈ ویل بینگ نے بتایا ہے کہ شراب اور منشیات سے فی لاکھ واقع ہونے والی ہلاکتوں کا تناسب ۴۳ سے بڑھ کر ۴۶ ہوچکا ہے۔

زمین کی نوعیت تبدیل ہورہی ہے۔ بہت کچھ بدل رہا ہے مگر ہم اب تک جاگنے کے لیے تیار نہیں۔ ہم میں سے بہت سوں کے نزدیک اب زندگی کا کوئی خاص مقصد نہیں رہا۔ جب کوئی مقصد نہ ہو تو زندگی بے کیف سی گزرتی ہے۔ یوں تو خیر دنیا بھر میں خرابیاں پائی جاتی ہیں مگر مغربی معاشرے کا معاملہ سب سے خطرناک ہے۔ اخلاقی اور روحانی اقدار کی پامالی نے اصلاحِ احوال کی گنجائش بھی نہیں چھوڑی۔ ہم بے سمت چل رہے ہیں اور کچھ معلوم نہیں کہ کہاں پہنچیں گے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Planetary collapse threatens our survival". ("The economic collapse". March 19, 2019)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950